مولوی نذیر احمد صاحب کے علمی مضامین

یعنے

جناب شمس العلماء مولانا مولوی حافظ نذیر احمد صاحب دہلوی مصنف
ترجمۃ القرآن وغیرہ کے بعض علمی مضامین کا مجموعہ

مرتبہ

منشی عبد الرحمن شوق امرتسری

جسکو

ملک دین محمد تاجر کتب کشمیری بازار لاہور

باہتمام ملک چراغدین مالک کیکسٹن
پرنٹنگ الیکٹرک بادہ کنس ہوس

قیمت صرف ..

عرضِ شوق

اہلِ قلم اور ہمدردانِ قوم کا کلام ترتیب دینا اور اُسے
کتاب کی صورت میں لاکر تعلیم یافتہ اصحاب کے ملاحظہ
میں خصوصاً اور طلباء کے مطالعہ میں عموماً پیش کرنا۔ اگرچہ
آسان ہے۔ لیکن خادمانِ اہلِ قلم کے نزدیک سہل بھی نہیں۔
اس سلسلہ میں سب سے پہلے سرسید کے اخلاقی مضامین کو کتابی
صورت میں منسلک کیا گیا تھا۔ جسکی مقبولیت نے مولانا شبلیؒ کے
تاریخی اور مولانا حالیؒ کے اخلاقی مضامین مرتب کرنے کے بعد
مولوی نذیر احمدؒ کے علمی مضامین مرتب کرنیکی خدمت ادا کرنے
کی جرأت دلائی۔ ان قومی خدمات کا معزز قوم سے یہی صلہ
مطلوب ہے۔ کہ ہمارے شائع شدہ بہترین اردو لٹریچر کی اشاعت
(جو قریباً ۵۰ عدد کتابوں کی تعداد میں ہے) اپنے حلقۂ اثر میں
فرماکر خادمِ قوم خاکسار شوق وان کے پبلشر ملک دین محمدؐ تاجر
کتب کشمیری بازار لاہور کو ممنون فرماویں +

خاکسار شوقؔ۔
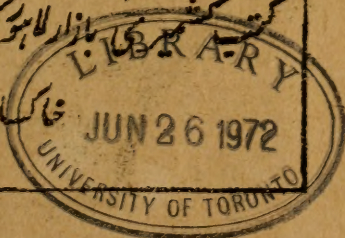
مولوی نذیر احمد صاحب کے علمی مضامین

انسان کی زندگی

انسان کی زندگی کیا ہے۔ ایک چھکڑا ہے کہ
مذہب کے لحاظ سے بیل تو نہیں کہا جا سکتا۔ مگر
ہاں دینی اور دنیاوی تعلیم کے دو گھوڑوں کے
بدون جگہ سے سرک نہیں سکتا۔ دینی یا مذہبی تعلیم
اپنی ذات سے تو دنیاوی تعلیم کی طرح کچھ ایسی دشوار
تھی نہیں۔ قرآن شریف میں خدا تعالیٰ کا حکم
"اللہ نے تم کو (دنیا کے لوگوں میں سے) انتخاب
فرمایا۔ اور دین (کے بارے) میں تم پر کسی طرح

کی سختی نہیں کی (تمہارے لئے وہی) دین (تجویز
کیا جو) تمہارے باپ ابراہیم کا (تھا) اسی (خدا)
نے (اگلی کتابوں میں) پہلے سے تمہارا نام مسلمان
رکھا (یعنی فرماں بردار بندے) اور اس (قرآن)
میں (بھی) تاکہ رسول تمہارے مقابلہ میں گواہ ہوں
اور تم (دوسرے) لوگوں کے مقابلے میں گواہ ہو تو
نمازیں پڑھو اور زکوٰۃ دو اور اللہ ہی کا سہارا پکڑو وہی
تمہارا کارزار ہے۔ تو (کیا ہی) اچھا کارساز ہے اور
(کیا ہی) اچھا مددگار۔

غرض دینی یا مذہبی تعلیم اپنی ذات سے تو دنیاوی
تعلیم کی طرح کچھ ایسی دشوار بھی نہیں۔ مگر پیشوایان
مذہب چابک سواروں کی بیجا تدبیروں سے تھوڑا ایسا
اڑیل ہو گیا ہے۔ کہ نہ آپ چلے اور نہ اپنی جوڑی کو
چلنے دے۔ ایک وقت تھا کہ اسلامی دنیا کے سارے
کام سارے انتظام شریعت کے مطابق انجام پاتے
تھے تو ان دنوں علم دین کا دائرہ بھی بڑا وسیع تھا۔
ان وقتوں کبھی اسلامی سلطنت کے مقابلے میں ہندوستان

کی کیا حقیقت ہے۔ اس پر بھی قوانین کا ایک انبار ہے اور واضعان قوانین ریشم کے کیڑوں کی طرح اُگل اُگل کر اُس انبار کو بڑھاتے ہی رہتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں نے من عند انفسھم دین و دنیا میں سوکنوں کی سی رقابت پیدا کی۔ اور اُن میں اعتدال قائم نہ رکھ سکے۔ دنیا سے کی بے اعتنائی۔ اس پر بھی دنیا بے حیائی سے مسلمانوں کے ساتھ رفاقت کیئے چلی گئی مگر ع "ہر ایک امر کی آخر کچھ انتہا بھی ہے" ادھر دنیا کے ساتھ کج ادائی اُدھر دین کی لگائی بجھائی مجبور ہو کر دنیا نے مسلمانوں کا ساتھ چھوڑا اُن میں جا ملی جو اس کے لینے کے لیئے ہاتھ پسارے بیٹھے تھے۔ اب دین رہ گیا۔ نرا نماز روزہ اللہ اللہ خیر صلّا زکوٰۃ کا مقدور نہیں۔ حج کی استطاعت نہیں۔ نماز روزے کو جتنا چاہو پھیلاؤ اور جتنے دن چاہو پڑھو بڑھاؤ۔ چیستان نہیں۔ معمّا نہیں۔ پہیلی نہیں۔ گورکھ دھندا نہیں۔ مولویوں کے مختلف فیہ مسائل نہیں۔ سیدھی سی بات ہے۔ دنیا تم کو درکار ہے یا نہیں۔ جس کو

دنیا درکار نہیں۔ اُس سے بحث نہیں۔ معارضہ نہیں روئے سخن نہیں۔ درکار ہے۔ تو اُس کے عزّت و ابرو کے ساتھ حاصل کرنے کا متعین ذریعہ ہے۔ انگریزی تعلیم۔ زبان کی الگ۔ سائنس کی الگ۔ جو شخص اس رائے کو تسلیم کرے۔ انگریزی شروع کر دیکھے۔ پھر وہ آپ ہی فیصلہ کر سکے گا۔ کہ وہ کتنا وقت مروجہ مذہبی تعلیم کے لئے دے سکتا ہے۔ دنیوی تعلیم کے کورس کا گھٹانا تو اس کمپیٹیشن کے زمانے میں اختیار سے خارج ہے۔ ہاں دینی کورس میرے نزدیک قرآن بس کرتا ہے۔ بشرطیکہ سمجھ کر پڑھا پڑھایا جائے۔ معاش کی طرف سے لوگوں پر اسقدر سختی ہوتی چلی جاتی ہے۔ کہ اگر مسلمان صرف قرآن ہی کو ضبط کئے رہیں تو باون تولے پاؤ رتی کے کھرے ٹکسالی مسلمان ہوں۔ دن و دنیا دونوں میں سُرخرو۔ یہ ہے میری بے غرضانہ صلاح ۔

"آگے چل کر (تم میری بات کو) جو میں تم سے کہتا ہوں یاد کرو گے۔ آخر میں تو اپنا

معاملہ خدا (ہی) کو سپرد کرتا ہوں بے شک
اللہ اپنے بندوں کا نگران حال ہے۔"

تعلیم اور اسکی غرض و غایت

تعلیم کی غرض و غایت کیا ہے۔ ہر شخص جس کے سر میں عقل ہے۔ بے تامل اس بات کو تسلیم کریگا۔ کہ آدمی جب عدم سے وجود میں آیا یعنی پیدا ہوا۔ اَب اس کو صرف اتنی بات درکار ہے۔ کہ اپنی زندگی آرام و آسایش سے بسر کرکے اپنے اصلی ٹھکانے سے جالگے۔ اسی کا نام علم اخلاق والوں نے اپنی اصطلاح میں سعادت رکھا ہے۔ اسی پر سے امام غزالی کی کتاب کا نام کیمیائے سعادت رکھا گیا ہے۔ اور یہ لفظ لیا گیا ہے قرآن سے:-

"(دو) قسم کے لوگ ہونگے، بعض بدبخت اور
بعض نیک بخت تو جو بدبخت ہیں وہ دوزخ
میں ہونگے۔(اور) وہاں اُنکو چلّانا اور دھاڑنا

(لگا) ہوگا۔ اور جب تک آسمان و زمین (قایم) ہیں۔ ہمیشہ (ہمیشہ) اسی میں رہیں گے مگر (اسے پیغمبر) جسکو تمہارا پروردگار (نجات دینا) چاہے۔ بے شک تمہارا پروردگار جو چاہتا ہے کر گذرتا ہے۔ اور جو لوگ نیکبخت ہیں تو (وہ) بہشت میں ہونگے۔ اور جب تک آسمان و زمین (قائم) ہیں (شروع سے) برابر اسی میں رہیںگے۔ مگر جس کو خدا چاہے (سزا دے کر بعد جنت میں داخل کرے یہ جنت خدا کی) دین ہے۔ جس کا کبھی خاتمہ ہی نہیں"۔

بہرکیف جب انسان پیدا ہوا۔ اب اُسکو اتنی بات درکار ہے۔ کہ اپنی زندگی آرام و آسایش کے ساتھ بسر کرکے اپنے اصلی ٹھکانے سے جا لگے۔ مگر وہ آرام و آسایش جو انسان کو زندگی میں درکار ہے۔ اس کے حاصل کرنے کے دو ذریعے ہیں۔ ایک یہ کہ اس کے قوائے عقلی کو تکمیل کے درجے پر لایا جائے۔ تاکہ ہرایک

قوت اُس غرض کو جس کے لئے وہ موضوع ہے
بخوبی پورا کر سکے۔ دوسرے انسان ٹھہرا مدنی الطبع
کہ وہ سوسائٹی کے بدون زندگی کر نہیں سکتا۔ اُسکی
تمدنی حالت ایسی ہو کہ وہ کسی کی اور کوئی اُس کی
عافیت میں خلل نہ ڈال سکے۔ پس تعلیم کے مفید
و نامفید ہونے کا معیار ٹھہرا۔ انسان کی آسایش
انسان کی عافیت۔ تو تعلیم کی دو شاخیں ہو گئیں۔ جو
تعلیم انسان کے قوائے عقلی کو ڈولپ کرے اُسکو
ہم دنیاوی تعلیم کہیں گے۔ اور جو تعلیم انسان کی
تمدنی حالت کی اصلاح کرے اُس کو دینی۔ یہ امر
داخل بداہت ہے۔ کہ اہل یورپ کے قوائے عقلی
بڑے زوروں پر ہیں۔ اور ریل اور اسٹیمر۔ اور تار برقی
اور انواع و اقسام کی مشینیں اُن ہی زوروں کے
آثار ہیں۔ دو چار سیدھی سادی کلیں دیکھنے کا اتفاق
ہوا۔ خدا علیم ہے کہ اُن کا کانسٹرکشن سمجھ میں نہیں
آتا۔ کیسے ذہن ہونگے جنھوں نے ان کو ایجاد کیا ہوگا
اچھا تو یہ زور اُن کے قوائے عقلی میں یہ انتقال

اُن کے ذہنوں میں کہاں سے آیا۔ آب و ہوا کا خواہی
تو کہہ نہیں سکتے۔ کیونکہ جب سے زمین و آسمان پیدا
ہوئے ہیں۔ آب و ہوا تو وہی ہے جو پہلے تھی لیکن
تاریخ بتارہی ہے۔ کہ اب سے زیادہ نہیں چار
ساڑھے چار سو برس پہلے ہمارے ملک کے گونڈوں
اور بھیلوں کی طرح اہلِ یورپ بھی وحشیانہ زندگی
بسر کرتے تھے۔ یا اور بہت سے ملک ہیں۔ جن کی
آب و ہوا یورپ کی آب و ہوا سے ملتی جلتی ہے اور
وہاں کے باشندے کندۂ ناتراش ہیں۔ ہو نہ ہو یہ
ترقی یہ عروج جو اہلِ یورپ کو ہے۔ سائنس کی تعلیم
کا نتیجہ ہے۔ جو یورپ میں تکمیل کے ساتھ دیجارہی
ہے۔ اور گورنمنٹ نے کمال فیاضی سے اُس کی ابجد
نیٹوز کو پڑھانی شروع کی ہے۔ فمنہم من امین بہ
و منہم من صد عنہ مصداق عنہ ہیں کم نصیب بدقسمت
بدبخت مسلمان ہیں۔ جو اب تک اس جدید تعلیم کی
طرف سے پس و پیش میں پڑے ہیں۔ پس اسکو
تو خدا کی طرف سے فیصل شدہ سمجھو کہ دنیاوی بہبود

و فلاح تو بدوں سائنس کی تعلیم کے ہو نی نہیں۔
ان شخصیاً فنشخصے و ان قومیاً فقومے مگر سائنس
کے خزانے انگریزی کے صندوقوں میں بند ہیں۔ پہلے
ان صندوقوں کو کھولنا سیکھو تب خزانے کو ہاتھ لگاؤ
اور نہیں سیکھتے تو سلطنتیں کھو کر رعیت بنے ہو آگے
اپنے ابنائے جنس کی غلامی کرو۔ جھڑکیاں سنو۔
جوتیاں کھاؤ۔ اگلوں کو ڈھکا سینتا ہو چکے تو بھیک
مانگو۔ مگر میری صلاح مانو تو سب سے آسان طریقہ
یہ ہے کہ مجھے بھی اپنے ساتھ لیکر ڈوب مرو ؎

قسمت میں قوم کے ہو لکھی صبح و شام موت
بے حرمتی کے جینے سے بہتر حرام موت

ہادیِ اسلام اور اُمّتِ سابقہ

جناب پیغمبر خدا صلّی اللہ علیہ وسلم مکّے کے رہنے
والے تھے۔ مکّے ہی میں پیدا ہوئے مکّے ہی میں
بڑے ہوئے۔ اُن کے تمام تعلقات مکّے ہی میں تھے

وطن سبھی کو عزیز ہوتا ہے۔ اُن کو بھی تھا۔ اور سب سے زیادہ تھا۔ اس لئے کہ اُن دنوں تمام جزیرۂ عرب میں مکہ اور طائف دو ہی بڑے شہر تھے مکہ تو معبدِ اہلِ عرب ہونے کی وجہ سے مرجع عام تھا اور طائف میں سال کے سال بڑا میلہ لگتا تھا۔ اور کثرت سے لوگ جمع ہوتے تھے تو پیغمبر صاحب کو ان ہی دو مقاموں میں اسلام کی منادی کرنے کا اچھا موقع ملتا تھا۔ مگر مخالفت کی اسقدر شورش تھی۔ کہ رہنا دشوار ہو گیا تھا۔ اس پر بھی پیغمبر صاحب نے مکہ نہ چھوڑا اور صبر و استقلال کے ساتھ خدمتِ رسالت بجا لاتے رہے۔ جس کے لئے وہ خدا کی طرف سے مامور ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ جب مخالفوں نے دیکھا کہ یہ شخص مزاحمتوں کی مطلق پروا نہیں کرتا۔ اور اپنا کام کئے چلا جاتا ہے اور چپکے چپکے اس کے اتباع بھی زیادہ ہوتے جاتے ہیں۔ تو انہوں نے ان کے مار ڈالنے کی ٹھہرائی۔ پیغمبر صاحب کو آگہی ہوئی تو حضرت ابوبکر کو ساتھ

لے رات کے وقت گھر سے نکل ایک پہاڑ کی کھوہ
میں جا چھپے۔ تین دن رات وہیں چھپے رہے
پھر اجنبی رستے سے ہوتے ہوئے مدینے جا پہنچے
جہاں کے چند آدمی حج کو آئے تھے اور طائف میں ان کے
مواعظ سن کر ان کے معتقد ہو گئے تھے۔ مسلمان
جہاں جہاں کفار کے نرغے میں تھے پیغمبر صاحب
کا جانا سن کر مدینے میں سمٹنے شروع ہوئے جیسکو
اسلامی اخوت اور قومی ہمدردی کے معنے سمجھنے ہوں
اُس کو چاہئے کہ اُس امداد اور مدارات پر نظر کرے
جو ایسے نازک وقت میں مدینے کے مسلمانوں نے
اپنے پردیسی بھائیوں کی کی۔ پیغمبر صاحب نے
ان بیکس مسلمانوں کو دو دو چار چار کرکے مدینے
والوں کے ذمہ کر دیا تھا۔ تو جو جس کا مہمان تھا
مہمان اور صاحب خانہ میں کسی طرح کا امتیاز نہ تھا
مثالیں تو بہت سی ہیں۔ مگر میں تمثیل کے طور پر
صرف ایک ہی مثال بیان کرتا ہوں۔ کہ عبدالرحمٰن
بن عوف مہاجر سعد بن الربیع کے حصے میں آئے

یتھے - سعد نے عبد الرحمٰن سے کہا کہ تم بی بی کے
نہ ہونے سے متاذّی ہوتے ہوگے - اور میرے نکاح
میں کئی عورتیں ہیں - میں ایک کو تمہارے لئے
طلاق دے دیتا ہوں - دیکھی اسلامی اخوت - دیکھی
قومی ہمدردی - انصار نے یہاں تک تو کیا تھا -
کہ مہاجرین کو اپنی جائداد میں برابر کا شریک کرنا چاہا
مگر وہ تو پیغمبر صاحب نے مدینے کے کسی مسلمان
پر بوجھ ڈالنا پسند نہیں کیا - اور بات چلنے نہ پائی ورنہ
انصار تو اپنی طرف سے دے ہی چکے تھے - جنکے
مریدوں میں جن کے شاگردوں میں اس درجے
کی سیرچشمی اس درجے کی فیاضی اس درجے کی
ہمدردی ہو اُن کا اپنا کیا پوچھنا ہے - آدمی کی ضرورتوں
میں دو چیزیں سب پر مقدم ہیں - کھانا اور کپڑا
سو کھانے کا یہ حال تھا - کہ ایک وقت اصحاب پر
بہت سخت گذر رہا تھا - اور عرب کے لوگ بڑے
زور کی بھوک میں پیٹ پر پتھر باندھ لیا کرتے تھے
کہ انتڑیوں کے دبے رہنے سے بھوک کی ایذا کم

محسوس ہُوا کرتی ہے۔ چنانچہ چند صحابی اسی حال سے فقر و فاقہ کی شکایت کے لئے پیغمبر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پیغمبر صاحب نے اُن کی تسکین کے لئے اپنے تئیں دکھایا۔ کہ دو پتھر باندھ رکھے تھے۔ خیبر میں۔ یہ خیبر نہیں جو کابل کے رستے میں پڑتا ہے۔ بلکہ مدینے سے کچھ فاصلے پر ایک گانوں تھا جہاں یہودی بستے تھے۔ اُن میں سے کچھ زمین پیغمبر صاحب کے ہاتھ آگئی تھی۔ اور وہ پیغمبر صاحب کی ذاتی جائداد تھی۔ اُس سے جو اناج آتا پیغمبر صاحب ازواجِ مطہرات میں سے ہر ایک کو اُن کے خرچ کی قدر سال بھر کا غلّہ دیدیا کرتے تھے۔ باقی مسلمانوں پر خرچ ہوتا تھا۔ مگر وہ سالانہ اس قدر کم تھا کہ اُس میں فراغت کے ساتھ کسی کا بھی گزر نہیں ہوتا تھا۔ آخر ایک دن سب نے ملکر نرغہ کیا یہاں تک کہ پیغمبر صاحب نے ناخوش ہوکر سب کو چھوڑ دینے کا ارادہ کیا مگر توسیع نفقہ نہیں کرنی تھی نہیں کی اور وہ غلّہ کیسی کفایت شعاری

کے ساتھ خرچ کیا جاتا تھا۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے۔ کہ بی بی عائشہ فرماتی ہیں۔ کہ ہم لوگوں میں چھلنی کا رواج نہ تھا۔ آٹا پیسا بھوسی پھونک مار کر اڑا دی۔ کتنی راتیں گذر جاتی تھیں کہ بیت نبوی میں تیل نہ ہونے کی وجہ سے چراغ نہیں جلتا تھا۔ پیغمبر صاحب کے حالات کہاں تک سنو گے۔ جوں جوں سنتے جاتے ہو حجت آلہی پوری ہوتی جاتی ہے۔ مگر خیر ایک بات اور بھی سہی۔ ایک بار حضرت عمرؓ حاضر خدمت ہوئے۔ پیغمبر صاحب لیٹے تھے اٹھ بیٹھے۔ تو پسلیوں میں کھجور کے پٹھوں کی بدھیاں پڑی ہوئی تھیں حضرت عمرؓ کو نہایت ترس آیا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ اللہ سے دعا فرمائیے کہ اس امت پر بھی وسعت کرے۔ اور یہ تمام عسرت نہ بخل کی وجہ سے تھی اور نہ بے مقدوری کی وجہ سے بلکہ ایثار کی وجہ سے یعنی پہلے اور پیچھے آپ لیکن آور اتنے تھے کہ اپنی نوبت ہی نہیں آتی تھی۔ یہ تو اگلے مسلمانوں کا

حال تھا جو صرف بدل اور انفاق فی سبیل اللہ کے متعلق مَیں نے بیان کیا۔ اور اب ذرا مجھ سے آنکھیں ملا کر کہو کہ ہم میں سے کسی پر ان کی چھینٹ بھی پڑی ہے؂

تو کے بدولتِ ایشاں رسی کہ نتوانی
جزایں دو رکعت و آں ہم بصد پریشانی

زمانہ حال

قرآن اور مسلمان

مسلمانوں کو عموماً اِلّا ماشاء اللہ خبر ہی نہیں کہ خدا ہم سے کیا چاہتا ہے۔ اور قرآن کے ذریعے سے ہم کو کیا تعلیم فرماتا ہے۔ مجھ کو بتاؤ اور از برائے خدا بتاؤ کہ فی صدی کتنے مسلمان اچھی خاصی عمر طبعی کو پہنچکر مر جاتے ہیں۔ جنھوں نے ساری عمر میں صرف ایک بار بھی سارا قرآن نہیں سُنا ہوتا ہے۔

عمل کو نہیں پوچھتا۔ کہ وہ دوسرے درجے میں ہے۔ اور علم پر متفرع ہوتا ہے۔ اور نہ عربی دانی کو پوچھتا ہوں۔ کہ یہ بھی ہر ایک سے ہو نہیں سکتا میں تو صرف اتنی بات پوچھتا ہوں۔ کہ کتنے مسلمان اچھّی خاصی عمر طبعی کو پہنچکر مرجاتے ہیں۔ جنھوں نے ساری عمر میں ایک بار صرف ایک بار بھی خود ترجمہ پڑھنے سے یا کسی دوسرے کے سنانے سمجھانے سے یہ بھی نہیں معلوم کیا کہ شروع سے آخر تک قرآن کا مطلب کیا ہے۔ بے شک مسلمانوں میں یہ تو ایک بڑی تعریف کی بات ہے۔ کہ قرآن کے لفظوں کی حفاظت کا بڑا اہتمام رکھتے ہیں۔ برسوں کی محنت میں ہزاروں مسلمان قرآن حفظ کرتے اور زندگی بھر اُس کو دوہراتے رہتے ہیں۔ اور ہمارے یہاں تعلیم کا سلسلہ ہی قرآن سے شروع ہوتا ہے۔ مگر قرآن کی وہ چیز جو مسلمانوں کو مسلمان یعنی انسان کو انسان بناتی ہے۔ اُس کے مطالب ہیں۔ نہ کہ الفاظ و مقاصد اُن انسان

کے لئے مفید ہیں۔ جو عربی زبان جانتے اور قرآن کی فصاحت و بلاغت کو سمجھتے ہیں۔ کہ اس سے اُن کا عقیدہ قرآن کی طرف سے خوب پکّا استدلالی ہو جاتا ہے۔ پس اسلام کے اعتبار سے ہم لوگوں کی مثال اس چوہے کی سی ہے۔ جو ہلدی کی ایک گرہ پانے سے اپنے تئیں پنساری سمجھنے لگا تھا۔ ہمارے اسلام کی حقیقت ہی کیا ہے۔ بس یہی نہ کہ مسلمان کے گھر پیدا ہوئے مسلمانوں کو کچھ کرتے دیکھا بے اعمالِ فکر و بسیار کرنے لگے ع

"آنچہ آدم می کند بوزینہ ہم"

کسی کٹھ مُلّا سے آئیں بائیں شائیں کچھ سُن پایا اُس کا یقین کر لیا۔ دین دار بن بیٹھے فہم مطلب کے اعتبار سے مسلمانوں نے۔ اور مسلمانوں سے میری مراد اکثر مسلمان ہیں ہرگز قرآن کی حق قدرہ قدر نہیں کی کہ اُس کو بالاستیعاب سُنتے سمجھتے اس کے مطالب میں غور کرتے۔ اصل

ہیں قرآن کے مطالب اور مضامین ہی تو تھے جنکی
وجہ سے اُن وقتوں کے اکثر عرب اسلام کے گرویدہ
ہوئے چنانچہ ایک مقام پر فرماتے ہیں۔

"اور (اے پیغمبر) مشرکین میں سے اگر
کوئی شخص تم سے پناہ کا خواستگار ہو
تو (اس کو) پناہ دو یہاں تک کہ وہ
(اطمینان سے) کلامِ خدا کو سُن سمجھ لے
پھر اُس کو اُس کی امن کی جگہ واپس
پہنچا دو یہ (رعایت ان لوگوں کے حق
میں) اس وجہ سے (کرنی ضرور) ہے
کہ یہ لوگ (اسلام کی حقیقت سے)
واقف نہیں۔" ۱۲

اسی تقریب میں مجھکو حریث بن زید الخیل کے
چند عربی شعر یاد آئے جو اُس نے اپنے چچا اوس
بن خالد کے مرثیے میں لکھے ہیں۔ مجھ کو ان
اشعار سے اس حکایت کا مطلب بیان کرنا ہے
جو ان اشعار سے متعلق ہے:-

الا ابلغوا الناعی باوس بن خالد
اخی الشتوۃ الغبراء والزمن المحل
وان یقتلوا بالغدر اوساً فاننی
ترکت اباسفیان ملتزم الرحل
فلا تجزعی یا ام اوس فانہ
لیبب المنایا کل حاف وذی نعل
قتلنا بقتلا نا من القوم عصبۃ
کراما ولم ناکل بھم حشف النخل
ولولا الاسی ماعشت فی الناس ساعۃ
ولکن اذا ما شئت جاوبنی مثلی

اور ان کی حکایت یہ ہے۔ کہ حضرت عمرؓ نے ابوسفیان کو (ابوسفیان یزید کے دادا نہیں یہ اس نام کے دوسرے صحابی ہیں) غرض حضرت عمرؓ نے ابوسفیان کو دیہات میں بھیجا کہ لوگوں سے قرآن پڑھوائے یہ ابوسفیان کا بھیجا جانا اس طرح کا تھا جیسے ہمارے زمانے میں مدارس کے انسپکٹر گانوں گانوں لڑکوں کا امتحان لیتے پھرتے ہیں۔ ابوسفیان

نے اَوْس بن خالد سے قرآن پڑھوانا چاہا۔ تو اَوْس نے انکار کیا۔ اس پر ابو سفیان نے تادیباً اُسکو تازیانے مارے۔ وہ اتفاق سے مرگیا۔ اَوْس کی ماں بیٹے کے ماتم میں لگی رونے پیٹنے۔ حریث نے مارے غصّے کے از خود رفتہ ہوکر ابو سفیان کو مار ڈالا۔ اور مرثیے کے طور پر یہ اشعار کہے۔ میری غرض یہ تھی۔ کہ وہ قرون اولیٰ کے لوگ جنھوں نے اسلام کو رواج دیا قرآن کے پھیلانے کا یہاں تک اہتمام کرتے تھے۔ اب اپنی کوشش کو اُن کی کوششوں سے ملاکر دیکھو۔ غرض تو اُن کی اور ہماری ایک ہے۔ کہ مسلمان دنیا میں قوم معزز ہوکر رہیں۔ اُن لوگوں نے اس غرض کے حاصل کرنے کے لئے صرف ایک قرآن کا کورس رکھا تھا۔ اور اُسی پر زور دیا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ وحشی سولیزیشن کے پایونیر ہوئے۔ اونٹوں کے چرانے والے بادشاہ اور بادشاہ بھی ایسے زبردست کہ یورپ کے سارے بادشاہ مل کر بھی تو اُن کی گرد کو نہیں

پاتے۔ اور بادشاہت ہی گھر میں آگئی۔ تو دولت
و عزّت کا کیا مذکور ہے۔ دولت اُس کی لونڈی
اور عزّت اُس کی سہیلی۔ جہاں سلطنت وہاں
دولت۔ جہاں سلطنت وہاں عزّت۔ ہم اپنی
کوششوں کے نتیجے پر نظر کرتے ہیں۔ تو سلطنت
اور عزّت تو بجائے خود دولت لونڈی تک بھی
ہماری رسائی نہیں۔ اور کورس یہی ہے تو ہوگی
بھی نہیں ؎

ترسم نہ رسی بکعبہ اے اعرابی
کیں راہ کہ تو میروی بترکستان است

ہم مسلمانوں کی حالت کی اصلاح تو جب ہوگی
قرآن ہی سے ہوگی۔ جو کچھ بھی تم ریفارمر
چاہتے ہو مسلمان سب کچھ کریں گے۔ مگر قرآن
کے کرانے سے کریں گے۔ نہ تمہارے رائے سے
اور نہ گورنمنٹ کے کرانے سے۔ جا بجا دار ندوہ ہو +
اور وہ عوام کو صرف قرآن کا ترجمہ سناتے ہیں۔
مکتبوں اور مدرسوں میں جب لڑکے عبارت کے

پڑھنے پر قادر ہو جائیں عربی خوانوں کے لئے متن سے ورنہ ترجمے سے کورس بنائے اور اُنکو پڑھائے جائیں۔ جب قرآن لوگوں کے دل میں جگہ کر لے گا۔ تو اُن کو آپ اُپج کی سوجھے گی +

اظہار درد اور خدا کی رحمت

درد خدا کی طرف سے رحمت کے پیرائے میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور ہم بندوں کی طرف سے باہمی الفت محبت شفقت ہمدردی خیر خواہی کی صورت میں دنیا میں کسی مذہب کو بھی درد کی رعایت سے خالی نہ پائیں گے۔ اس لئے کہ مذہب کی بنیاد ہی درد پر رکھی گئی ہے۔ بلکہ بعض نے تو درد کے بارے میں اتنا مبالغہ کیا ہے۔ کہ جس طرح بہت شیرینی جو بد ذائقہ ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اُنھوں نے درد پر اتنا زور دیا۔ کہ وہ امکان سے باہر ہو گیا اور اگر اُس درد کو حد سے زیادہ کیا جائے تو بجائے اس کے کہ امن و عافیت

کو ترقی دے اُس میں خلل انداز ہو ؎

لطفِ حق باتو مواسا ہا کند
چوں کہ از حد بگذرد رسوا کند

عیسائیوں کے یہ احکام کہ اگر کوئی تیرے داہنے گلے
پر طپانچہ مارے تو تُو بایاں بھی اُس کے آگے کر دے
یا یہ کہ اپنے اکلوتے بیٹے کی طرح جانی دشمنا کے حق
میں صدق دل سے دعا کر اسی قبیل سے ہیں۔
ہندوؤں میں بھی دیا کی بڑی تاکید ہے۔ یہاں تک
کہ اُن کے ہاں جان کے مارنے سے بڑھ کر کوئی
ہتیا نہیں ہے ؎

میازار مورے کہ دانہ کش است
کہ جان دارد و جان شیریں خوش است

ان میں کا ایک گروہ رات کو گھر میں چراغ نہیں جلاتا
مُنہ پر کپڑا لٹکائے رہتے ہیں۔ گئو کی رکھشا کرتے
جانوروں کے پانی پینے کے لئے بازاروں میں پیاؤ
بٹھائے رکھتے۔ چیونٹیوں کے بلوں میں کھانڈ ڈالتے
پھرتے ہیں۔ بے شک درد ہی اصل دین ہے۔ درد

ہی وہ ستون ہے۔ جس پر زمین و آسمان کھڑے ہیں۔ درد ہی دنیا کی فلاح اور آخرت کی نجات کا ذریعہ ہے۔ درد ہی دینداری اور خدا پرستی کی معیار ہے۔ ع "آں را کہ عقل بیش غم روزگار بیش"
لوگ تو اس کے یہ معنے کرتے ہیں کہ جس میں عقل بہت ہوتی ہے۔ وہ سب سے زیادہ دنیا کے بکھیڑوں میں مبتلا رہتا ہے۔ اور مَیں یہ معنی کرتا ہوں اور یہی ہَیں۔ اور یہی ہونے چاہئیں کہ جس میں عقل بہت ہوتی ہے اُس کو ابنائے روزگار کا درد بہت زیادہ ہوتا ہے۔ یعنی درد ہی عقل کی کمی بیشی کی شناخت کی کسوٹی ہے۔ بزرگانِ دین کے حالات پر نظر کرو گے تو پاؤ گے کہ یہی درد ان کے رگ و پے میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ ہم جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے شروع کرتے ہیں کہ اُن کو جس قدر اُمت کا درد تھا۔ ہم اُس کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔

"(لوگو!) تمھارے پاس تم ہی میں سے

ایک رسول آئے ہیں۔ تمھاری تکلیف
ان پر شاق گذرتی ہے۔ اور، ان کو
تمھاری بہبود کا ہوکا ہے (اور) مسلمانوں
پر نہایت درجے شفیق (اور) مہربان ہے"۔

وہ ہمہ وقت ایک ایک مسلمان کے لیئے جان تک
دینے کو موجود تھے۔ وہ مسلمانوں کو ننگا بھوکا نہ دیکھ
سکتے اور آپ فقر و فاقے سے بسر کرتے۔ اِس سے
بڑھ کر فقر و فاقہ اور کیا ہوگا۔ کہ ساری عمر جَو کی
روٹی پیٹ بھر نہ کھائی۔ پیٹ پر پتھر باندھے کہ
بھوک کی ایذا محسوس نہ ہو۔ اکثر ایسا ہُوا کہ بیت
نبوی میں چراغ نہیں جلا۔ صحابہ کسی ضرورت
سے حاضر خدمت ہوئے آپ لیٹے تھے اُٹھ بیٹھے
تو پہلوؤں میں کھجور کے بوریئے کی دھجیاں پڑی ہوئی
تھیں۔ یہ دیکھکر صحابہ کا دل بھر آیا۔ اور بہ فرق مراتب
قریب قریب یہی حال اہلِ بیت اور صحابہ کا تھا۔
رضوان اللہ عنہم اجمعین۔ ان لوگوں نے اسلام کی
کھیتی کو خون اور پسینے سے سینچا تب کہیں جاکر وہ

پھلی پھولی۔ اور اس میں عزّت اور دولت اَور سلطنت اور تہذیب اَور شائستگی کے پھل لگے سہ

تو کے بدولتِ ایشاں رسی کہ نتوانی
بجز دو رکعت و آن ہم بصد پریشانی

لفظ اسلام اور اُس کی حقیقت

اسلام کے اصل معنی ہیں انقیاد گردن نہادن اور وہ نکلا ہے سلام سے جس کے معنی سلامتی کے ہیں سَلاَم خدا کا بھی نام ہے۔ کیونکہ وہ اپنی ذات سے ہمیشہ سلامت ہے۔

اللھم انت السلام ومنك السلام والیك یرجع السلام سلامِ متعارف کو سَلاَم اسی وجہ سے کہتے ہیں۔ کہ وہ سلامتی کی دعا ہے۔ سِلْمَہ پتھر کو بھی کہتے ہیں۔ کہ وہ ٹوٹ پھوٹ سے محفوظ رہتا ہے۔ اور اسی سے حجر اسود کے چھُونے اور بوسہ دینے کو اِستلام کہتے ہیں۔ بیع سلم مشہور

ہے۔ کہ اُس میں پہلے سے ایک زخم کو محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ سِلْمٌ صلح کہ اُس کے ذریعے سے مخالف کے شر سے محفوظ رہتے ہیں۔ سُلم سیڑھی کہ وہ ذریعہ ہے بلندی پر محفوظ پہنچنے کا۔ مار گزیدہ کو تفاولاً سَلیم کہتے ہیں۔ مسلمان۔ سُلیمان۔ سَلَمہ۔ سَلمہ۔ سلمیٰ۔ سُلَیم۔ لوگوں کے دعائیہ نام ہیں۔ جیسے عائشہ جسکا ترجمہ جیونی ہے اور فاطمہ جس سے مراد ہے کہ خیریت و عافیت سے دودھ چھوٹے۔ جیسے تمہارے پنجاب میں اللہ جوایا۔ اللہ جوائی۔ سُکھ بھرائی۔ غرض سین لام میم کے مادے میں سلامتی اصل ہے۔ اور اُس کے کل مشتقات میں سلامتی کے معنی پائے جاتے ہیں۔ اسلام بھی اسی وجہ سے اسلام کہلایا۔ کہ مطیع و منقاد ہوکر رہنا یعنی سے

"با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا"

رکھنا دونوں جہاں کی سلامتی کا موجب ہے اگرچہ صفت اطاعت و انقیاد اسلام کی اصل وضع میں داخل ہے۔ مگر اب تو کوئی بھول کر بھی اس کا

خیال نہیں کرتا۔ اور مسلمان کہنے سے قوم کی طرف
تو ذہن منتقل ہوتا ہے۔ مگر اطاعت و انقیاد کیطرف
نہیں جو مسلمان کی وجہ تسمیہ تھی۔ اے کاش
یہ بات مسلمانوں کو ہمہ وقت پیش نظر رہتی کہ ہم
مسلمان کس لئے مسلمان کہلائے۔ ہم مسلمان کہلائے
اطاعت و انقیاد سے۔ اور جب یہ نہیں تو ہم مسلمان
کہاں کے۔ بر عکس نہند نام زنگی کافور۔

مذہب بغیر صداقت کے نہیں پھیل سکتا

پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

میرا خیال تو یہ ہے۔ کہ دنیا میں کوئی مذہب
بھی تلوار کے بل بوتے پر نہیں چلا۔ مذہب چلا ہے
اور چلے گا تو صرف صداقت کے بل بوتے پر۔ یہ
سُن کر تو مسلمانوں نے کان کھڑے کیے ہونگے اور
نہ صرف مسلمانوں نے بلکہ ہر مذہب کے لوگوں نے
کہ آج تو روپیں اس کا عقیدہ کھل پڑا کہ نفس

مذہب کی نسبت کہتا ہے کہ مذہب چلا ہے اور چلیگا تو صداقت کے بل بوتے پر۔ تو اس سے لازم آتا ہے۔ کہ سب مذہب سچے اور برحق ہوں ہاں ہاں مَیں پکارے کہتا ہوں کہ مذہب چلا ہے اور چلے گا تو صرف صداقت کے بل بوتے پر۔ اور میری مراد یہ ہے۔ کہ دنیا میں کوئی مذہب نہیں جس میں صداقت کا انش یعنی جزو نہ ہو۔ جتنے مذہب دنیا میں ہیں۔ وقت اور مقام کے لحاظ سے سب کے سب آدمی کی اصلاح اور فائدے کے لئے چلے ہیں۔ اور ہر ایک میں کچھ نہ کچھ فائدے اور صداقت اور نیکی کا انش ضرور ہے۔ جو اُن کو چلائے جاتا ہے۔ مثلاً اگر ہندو اس ملک میں گائے کی تعظیم مذہباً کرتے ہیں۔ تو اس میں یہ فائدہ مضمر ہے۔ کہ اس ملک میں کوئی جانور گائے بیل سے زیادہ آدمی کو فائدہ رساں نہیں۔ گائے دودھ دیتی ہے۔ جس سے گھی اور مکھن اور پنیر اور انواع واقسام کی مٹھائیاں بنتی ہیں۔ بیل کے بدوں کھیتی

نہیں ہو سکتی۔ مرے پیچھے بھی اس بیچارے کی کھال کام دیتی ہے۔ کسی اور جانور کا نام لو۔ جس سے آدمی کے اتنے سارے کام نکلتے ہوں۔ اس کی پوری پوری حفاظت ہو نہیں سکتی تھی۔ تاوقتیکہ مذہباً اُس کو مقدس نہ مانا جائے۔ یا گنگا جمنا کی تعظیم بلکہ تمام دریاؤں کی کہ اُن سے زراعت کی آبپاشی ہوتی ہے۔ جانداروں کی زندگی پانی پر موقوف ہے۔

"اور پانی سے تمام جاندار چیزیں بنا دیں"

لیکن یہ باتیں اُس وقت سوجھتی ہیں۔ جب مزاجوں میں سازگاری ہوتی ہے۔ نہیں تو ؎

چشم بداندیش کہ برکندہ باد
عیب نماید ہنرش در نظر

مسلمانوں کو تو یہ سمجھنا چاہیئے کہ ہندو اگر گائے کی رکھشا کرتے ہیں تو اپنے فائدے کی احراز کی غرض سے کرتے ہیں۔ اور اس میں ان پر الزام کی کوئی بات نہیں۔ اُدھر شارع اسلام نے دیکھا کہ آدمی جہاں

تنگ ہو سکتا ہے۔ اپنے مفاد کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔

"بیشک آدمی بڑا ہی تھڑچیا پیدا کیا گیا
ہے۔ کہ جب اُس کو (کسی طرح کا)
نقصان پہنچتا ہے۔ تو گھبرا اُٹھتا ہے
اور جب اُس کو (کسی طرح کا) فائدہ
پہنچنے لگتا ہے تو بخل کرنے لگتا ہے"

گائے بیل کی حفاظت کے بارے میں از روئے مذہب حکم دینا تحصیل حاصل ہے۔ اب رہا تقدس سو انسان خود اشرف المخلوقات ہے۔

جو کچھ کہ جہاں میں ہے سب انسان کیلئے ہے
آراستہ یہ گھر اسی مہمان کے لئے ہے

اور مخلوقات کی طرح گائے بیل بھی انسان کی خدمت کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ اور ساری عمر انکو انسان کی خدمت ہی کرتے گزرتی ہے۔ اور خدمت بھی شاقہ اور مبتذل۔ میرے گھر کے قریب کھاری باؤلی کا مشہور بازار ہے۔ اور وہ اناج کی منڈی

ہے۔ اور غلہ فروش جھڑا ہندو کیونکہ مسلمان تو نرا
کھانا جانتے ہیں۔ اور کھانا بھی ٹھنٹھنے کے ساتھ۔ اناج
کی دکان لیکر بیٹھیں تو بنئے کہلائیں اور ادعائی
عزت کرکری ہو۔ بہرکیف کھاری باؤلی میں اس
سرے سے اس سرے تک تو تمام غلہ فروش
ہندو ہیں۔ دوسرے ان ہی ہندؤں کی وجہ سے
بازار میں گائے بیل بہت چھوٹے پھرتے ہیں۔
کہ یہ لوگ ان کی خدمت کرتے ہیں۔ لیکن ایک
طرف تو خدمت کرتے ہیں۔ میں نے بعض کو حلوا
پوری۔ کچوری اور عمدہ مٹھائی کھلاتے دیکھا ہے۔
اور دوسری طرف ہر دکان کے آگے ایک
آدمی لٹھ لئے بیٹھا ہوتا ہے۔ کہ گائے بیل نے
اناج کے ڈھیر کی طرف رخ کیا اور اس نے ایک
لاٹھی سہی کی۔ کہاں تقدس اور کہاں یہ مدارات
اس سے بڑھ کر ایک اور غضب کی بات سنو کہ
کھلیان گاہی جاتی۔ یعنی پیداوار سے دانہ نکالا جاتا
ہے۔ تو اس کی یہ تدبیر کرتے ہیں۔ کہ انبار لگا کر اسکو

بیلوں سے روندواتے ہیں۔ بیچارے بیلوں کے کھر گھائل ہو ہو جاتے ہیں۔ اور ہم نے بیلوں کے پاؤں میں کیڑے پڑے دیکھے ہیں۔ اوّل تو ادعائی تقدس اسی کو کیا جائز رکھتا ہے۔ کہ بیل سے ایسی سخت محنت لی جائے۔ پھر اُس پر یہ ظلم کہ گاہتے وقت بیلوں کے منہ پر جالی کا توبڑہ چڑھا دیتے ہیں کہ کہیں بیل اناج کے انبار میں منہ نہ ڈال دے اے آدمی اللہ رے خود غرضی۔ اللہ رے تیری حرص۔ اللہ رے تیرا بخل۔ بیل نے تو زمین جوت کر مصیبت سے اناج پیدا کیا اور تو اُس کی محنت کی پیداوار سے اسی کو ایک لقمہ نہ کھانے دے۔ یہ جو لاکھوں من دودھ آدمی ڈوہتے ہیں۔ اپنے مزے کی خاطر بچھڑوں کا پیٹ کاٹتے ہیں۔ اور اُسی سے گائے بیل کی نسلیں روز افزوں کمزور ہوتی چلی جارہی ہیں۔ غرض استخدام کا قاعدہ "تاکہ ان میں ایک کو ایک اپنا محکوم بنائے رکھے"۔

گائے بیل کے تقدس کو چلنے نہیں دیتا۔ اور یہ اسلامی تعلیم کے خلاف ہے۔ کہ کہو سب کچھ اور کرو کچھ نہیں ۔

"مسلمانو! ایسی بات کیوں کہہ بیٹھا کرتے ہو۔ جو تم کر کے نہیں دکھاتے

(یہ بات) اللہ کو سخت ناپسند ہے۔ کہ کہو (سب کچھ) اور کرو کچھ نہیں"

پس ہم کو تو اسلامی اصول بالکل ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ کہ گائے بیل کی حفاظت کو آدمی کی طبیعت پر چھوڑ دیا جائے۔ یعنی گائے بیل سے آدمی کا کام نکلتا ہے۔ اور گائے بیل کا بکار آمد ہونا اس کی حفاظت کے لئے کافی ہے۔ ہم نے گاڑی بانوں اور کاشتکاروں کو گھوڑوں کی طرح بیلوں کو راتب کھلاتے اور ان کی مالش اور پمپی کرتے دیکھا ہے گائے بیل جس کے کام کے ہیں۔ اس کو وہ بچوں کی طرح عزیز ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں جیسی قدر گائے بیل کی ہے۔ ویسی ہی عرب میں گھوڑوں

حماسہ جو ادب عربی کی مشہور کتاب ہے اُس میں جا بجا اس قسم کے اشعار پائے جاتے ہیں۔ کہ گھر میں ایک اونٹنی دودھ دیتی ہے۔ اور دودھ بچھیرے کو پلایا جاتا ہے۔ اور بچوں کو نہیں دیا جاتا۔ بچوں کی ماں ناخوش ہے اور باپ بچھیرے کے آگے بی بی بچوں کی پرواہ نہیں کرتا۔ ایک بادشاہ کسی قبیلہ کی گھوڑی پسند کرتا ہے۔ اور گھوڑی کا مالک گھوڑی کے دینے سے رضامند نہیں قبیلے کا قبیلہ گھوڑی کے واسطے بادشاہ سے بمقابلہ پیش آتا ہے۔ تو غرض اس طول مقال سے یہ ہے۔ کہ ہر ایک مذہب کے بزرگ اس مصلحت پر نظر نہ کر کے اُن سے پرخاش کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ ایک عجیب بات یہ دیکھی جاتی ہے کہ صرف لفظی اختلاف لوگوں میں پھوٹ ڈالنے کے لئے بس کرتا ہے۔ ورنہ ہم بہت سی نیکیوں کو مذاہب میں باوجود اختلاف مشترک پاتے ہیں خاص کر وہ جن پر تمدن کا مدار ہے۔ جھوٹ بولنا

شراب پینا۔ جوا کھیلنا۔ چوری کرنا۔ لوگوں کو ناحق
ستانا۔ وغیرہ وغیرہ سب مذہبوں میں ممنوع
ہیں۔ اور ممنوع نہ ہوں تو تمدن ایک دن قائم
نہ رہے۔ مسلمانوں کی نماز۔ ہندوؤں کی پوجا پاٹ
اُن کی زکوٰۃ۔ اُن کا دان پُن۔ اُن کے روزے
اُن کے برت۔ اُن کا حج۔ اُن کا تیرتھ۔ اُن کا رحم
اُن کی دیا۔ کیا یہ مماثل نیکیاں نہیں ہیں۔ اور
کیا ایک ہی تحریک۔ ایک ہی ارادے۔ ایک
ہی قصد سے صادر نہیں ہوتیں۔ مگر ہندو مسلمان
کی آواز سننا نہیں چاہتا۔ مسلمان ہندو کے
سنکھ کی برداشت نہیں کرسکتا۔ سنو کان لگا کر
سنو میں اسی بات کو جو ابھی کہہ چکا ہوں پھر
ایک بار اعادہ کرتا ہوں تاکہ تم لوگوں پر حجت الٰہی
تمام ہو۔ اور میرا مطلب اچھی طرح لوگوں کے
ذہن نشین ہو جائے۔ غرض کسی مذہب کی کوئی
بات لو اُس کو پاؤ گے کہ وقت اور مقام کے لحاظ
سے اس میں کچھ نہ کچھ آدمی کا فائدہ ہے۔ اُس

میں نیکی ہے۔ اُس میں صداقت ہے +

مذہب اسلام فطرت کے مطابق ہے

اسلام جیسا خود فطرت کے مطابق ہے۔ ویسی ہی اُس کی ترقی بھی خود بالکل فطرت کے مطابق ہوئی اور اُس کا تنزل بھی بالکل فطرت کے مطابق ہو رہا ہے۔ اور اسلام کی کیا تخصیص ہے۔ دنیا کے جتنے واقعات ہیں سب ہی فطرت کے مطابق ہوا کرتے ہیں۔

"تو (اے پیغمبر) تم خدا کے قاعدے کو
ہرگز بدلتا ہوا نہ پاؤ گے۔ اور نہ خدا کے
قاعدے کو کبھی ٹلتا ہوا پاؤ گے" ۱۲

اسلام بڑھا جس طرح ایک سچے مذہب کو بڑھنا چاہئے تھا۔ یعنی سب سے پہلے اُس کی پارٹی میں داخل ہوئے۔ جن کو راستی کے مان لینے میں کوئی امر از قسم حب جاہ و مال مانع نہیں ہو سکتا تھا۔

دنیاوی حالت کی خستگی کی وجہ سے ان کے دل
اصلی اور روحانی تشفی کے جویا تھے۔ اور وہ ان
پر پیش کی گئی اور انہوں نے اس کو ایسے شوق
سے لیا جیسے پیاسا شربت کو۔ یا بھوکا غذائے
لطیف کو۔ ان کو طرح طرح کے عذاب دئے گئے
مگر انہوں نے وہی کہا جو فرعون کے جادوگروں
نے کہا تھا۔ جب وہ موسیٰ پر ایمان لا چکے تھے۔

"تو (یہ دیکھ کر) جادوگر سجدے میں گر
پڑے اور لگے کہنے کہ ہم ہارون اور
موسیٰ کے پروردگار پر ایمان لائے۔
(فرعون نے) کہا کیا قبل اس کے کہ
ہم تم کو اجازت دیں تم موسیٰ پر ایمان
لے آئے ہو نہ ہو یہ تمہارا بڑا (گورو) ہے
جس نے تم کو جادو سکھایا ہے۔ تو تمہارے
ہاتھ اور تمہارے پیر اُلٹے (سیدھے) کاٹ
ڈالوں اور تمکو کھجوروں کے تنوں پر
سولی چڑھاؤں تو سہی اور (اب) تم کو

(اچھی طرح) معلوم ہو جائیگا۔ کہ ہم (دونوں فریقوں) میں کس کی مار زیادہ سخت اور دیرپا ہے۔ (جادوگر) بولے کہ کھلے کھلے معجزے جو ہمارے سامنے آئے ان پر اور جس (خدا) نے ہم کو پیدا کیا ہے اُس پر تو ہم تجھ کو کسی طرح ترجیح دینے والے ہیں نہیں۔ تو جو تو کرنے والا ہے کر گزر۔ تو دنیا کی اسی زندگی (کے بارے) میں حکم چلا سکتا ہے اور بس ہم اپنے پروردگار پر ایمان لا چکے ہیں۔ تاکہ وہ ہمارے گناہوں کو معاف کرے اور (خاصکر) جادو (کے گناہ) جس پر تو نے ہم کو مجبور کیا اور اللہ (کی دین تیری دین سے) بہتر اور زیادہ دیرپا ہے ۔ ؎۱

یہی حال تھا بلالؓ کا کہ وہ ایک مشرک کے غلام تھے۔ اور وہ ان کو عرب کی گرمیوں میں تپتے ہوئے کنکروں پر دھوپ میں لٹا کر اوپر سے پتھر رکھ

دیتا۔ اور اُن سے کفر بکوانا چاہتا۔ سارے دن اسی عذاب میں مبتلا رہتے۔ اور شام کو احد احد کرتے اُٹھتے اور بلال رضی اللہ عنہ کے علاوہ عمار بن یاسر کی والدہ کو مشرکوں نے اسلام کی وجہ سے بڑی بیدردی اور فضیحت سے مار ہی ڈالا تھا۔ اور اس طرح کی سینکڑوں مثالیں تاریخ کی کتابوں میں لکھی ہوئی موجود ہیں۔ پھر سب سے پہلے اسلام میں داخل ہوئے وہ لوگ جو پیغمبر صاحب کے ساتھ گہرا اختلاط اور اُن کے حالات سے پوری پوری آگہی رکھتے تھے۔ مثلاً ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ۔ علی بن ابی طالب۔ ابو بکر۔ اور یہ لوگ اسلام میں داخل ہوئے بھی تو ایسے نازک وقت میں۔ جب بڑے سے بڑا دور اندیش آدمی بھی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ کہ اسلام کو بھی کبھی دنیاوی عروج ہوگا۔ کسی شخص کے چال وچلن کی نسبت صحیح رائے قائم کرنے آسان کام نہیں ہے۔ مثلاً ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ کا اپنے شوہر پیغمبر صاحب

پر ایمان لانا اس کا محل یہ بھی ہو سکتا ہے
کہ وہ پیغمبر صاحب کو خوش کرنے کے لیئے اُن
کی خاطر سے ایمان لے آئی ہوں۔ مگر مجرد
ام المومنین خدیجہ اور پیغمبر صاحب کے تعلق
زنا شوئی کی بنا پر خدیجہ کے ایمان کی طرف
سے بدگمان ہونا انصاف کی بات نہیں۔ ایسی
بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ ایمان کے مقابلے
میں لوگوں نے ان تعلقات کی مطلق پروا نہیں
کی بلکہ اختلاف عقاید زن و شوہر کے ایک دوسرے
سے چھوٹ جانے کا باعث ہوا ہے۔ مَیں ایسے
کئی خاندانوں کے حال سے واقف ہوں کہ ایک
میں بی بی سُنّی ہے اور شوہر شیعہ ان دونوں
میں اختلاف مذہب کی وجہ سے ایسی اَنْ بَنْ
رہا کرتی ہے۔ کہ چھوٹے داخل ہیں۔ ابھی حال
میں ایک غیر مقلد عورت نے شوہر سے صرف
اس لیئے طلاق لی کہ وہ بڑا غالی مقلد تھا۔ ایک
منگنی جس سے طرفین رضامند تھے نہیں ہوئی

صرف اس وجہ سے کہ لڑکا علیگڈھ کالج میں پڑہتا اور انگریزی لباس رکھتا ہے۔ میں نے اپنے عزیزوں میں ایک مولوی کو اپنی بیوی سے لڑتے دیکھا۔ مولوی صاحب بیوی سے معتقدانہ آداب کے خواہاں تھے۔ اور بی بی اُن سے کہہ رہی تھی۔ کہ موئے میں تیرے رگ وریشہ سے واقف ہوں بہت میرے سر چڑھے گا تو ابھی سارا لفافہ اُدھیڑ کر رکھہ دونگی۔ خدیجۃ الکبریٰ کی نسبت معلوم ہے۔ کہ اسلام میں آنے سے پہلے اعلیٰ درجے کے مذہبی خیالات رکھتی تھیں۔ وہ پیغمبر صاحب کی راستی اور دیانت کی گرویدہ ہوئیں۔ اور ان کو شام کی طرف قافلہ سالار بناکر بھیجا اور آخرکار اپنے نکاح کا پیام دیا۔ ان کے خاندان میں دین و مذہب کا بڑا چرچا تھا۔ ان کے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل توراۃ کے بڑے عالم تھے۔ اور جب پیغمبر صاحب کو نزول وحی کی ابتدا میں خوف ہوا اور غار حرا میں جہاں اکیلے بیٹھ کر عبادت کیا کرتے تھے ڈر کر

بھاگیے۔ اور خدیجہ سے گھر آکر کہا کہ میں ناما نوس
آوازیں سنتا ہوں۔ اور مجھ کو عجیب عجیب شکلیں
دکھائی دیتی ہیں۔ وہ اُن کو ورقہ پاس لے گئیں۔
ورقہ نے پیغمبر صاحب سے کہا کہ وہ ناموس اکبر
یعنی جبریل فرشتہ ہے جس کو تم نے دیکھا اور
اگر میں تمہارے مبعوث ہونے تک زندہ رہا۔ تو
تمہارے مددگاروں میں ہونگا۔ اور خدیجۃ الکبریٰ
یہ کہہ کر پیغمبر صاحب کی تشفی کرتی رہیں۔

"تو اُس چیز کو حاصل کر سکتا ہے۔ جو
دوسرے کسی کو نہ مل سکے۔ اور تو مہمان
کی عزّت کرتا ہے۔ تو حادثات میں لوگوں
کی مدد کرتا ہے اور صلہ رحم کرتا ہے"۔۱۲

تم جیسے نیک بندے کو ہرگز خدا ضائع نہیں ہونے
دیگا۔ کیا ایسی نیک نہاد بی بی کی نسبت ایک لمحہ
کے لئے بھی ایسا شبہہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ پیغمبر
صاحب کی خاطر سے اسلام لائیں۔ بات یہ ہے کہ جو
لوگ اسلام کی صداقت کی طرف سے کسی طرح کا

شک رکھتے ہیں وہ نہ تو اسلام کی حقیقت سے واقف ہیں نہ مسلمانوں کا برتاؤ اُن کو حقیقت اسلام سے واقف ہونے دیتا ہے۔ اور نہ اُن کو تاریخی واقعات سے آگہی ہے۔ اُن وقتوں کے اہل عرب میں اسلام کا رواج پانا ہی اسلام کی آسانی اور صداقت کی کافی دلیل ہے۔ جو شخص شبہ کرتا ہے کہ اسلام نے تلوار کے زور سے رواج پایا۔ اگر عرب (اُن وقتوں کا عرب) ہمارے ہندوستان جیسا ہوتا۔ اور وہاں کے باشندے (اُن وقتوں کے باشندے) ہماری طرح کے آرام طلب۔ کاہل۔ بزدل ڈرپوک ہوتے۔ تو سب سے پہلے ہم آپ شبہ کرتے۔ ہمارا حال تو یہ ہے کہ اتنا بڑا ہندوستان اور اس میں سکھ اور گورکھے اور مرہٹے اور جاٹ اور مسلمان ایک سے ایک سورما اور کوڑیوں نیٹو سٹیٹ اور سب کے پاس گڑھیاں اور قلعے اور لشکر اور ہتھیار اور ایسے وسیع اور مختلف العناصر ملک میں کلھم بہتر ہزار گورے اور ایسی ٹھہراؤ کی حکومت کہ ہندوستان

کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں۔ ہم اسلام کی نسبت شبہ کرتے ہیں۔ تو اُن وقتوں کے اہل عرب کو اپنے اُوپر قیاس کر لیتے ہیں۔ حالانکہ اُنکا بچہ بچہ پیدائشی سپاہی تھا۔ عورتوں کی سنگدلی کی ایسی مثالیں ہیں کہ اُن کو سُن کر کلیجہ دہل جاتا ہے۔ کہ ابو سفیان کی عورت ہندہ حضرت حمزہؓ کا کلیجہ نکال کر کھا گئی۔ ہم سے تو کوئی لاش کے پاس جانے کو کہے تو ہیاؤ نہ پڑے۔ وہ لوگ مرنے مارنے کو ایک کھیل سمجھتے تھے۔ وہ کبھی کسی کے مطیع ہو کر نہیں رہے۔ اور اب بھی نہیں۔ ان کو زیر کرنے کے لئے اکیلی تلوار ہرگز کافی نہ تھی۔ اسلامی گورنمنٹ اوّل ڈویل گورنمنٹ تھی۔ یعنی پیغمبر صاحب دینی اور دنیاوی دونوں حکومتوں کے جامع تھے مگر گورنمنٹ کا یہ رنگ پیغمبر صاحب کی حیات تک رہا۔ اس لئے پیغمبری کی حکومت شخصی حکومت تھی۔ پیغمبر صاحب کی وفات کے بعد خلافت راشدہ تک بھی اُس کی شان باقی رہی اور پھر دوسری

گورنمنٹوں کی طرح ملک مخصوص ہو گیا۔ یعنی نرمی دنیاوی حکومت۔ دنیاوی حکومت زبردستی پیغمبر صاحب کے پلّے باندھی گئی تھی۔ یعنی اسلام کے مخالفوں نے خود چھیڑ چھاڑ کی۔ پیغمبر صاحب نے وہاں تک طرح دی جہاں تک طرح دینا ممکن تھا ایذاؤں پر صبر کیا۔ مجبور ہو کر جلا وطنی اختیار کی پردیس میں بھی دشمنوں نے چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ ناچار اپنے بچاؤ کے لئے مقابلہ کرنا پڑا۔ بچاؤ کرتے خدا ملک فتح کرا دے تو یہ اس کی دین ہے

"یہ اللہ کا فضل ہے۔ جس کو چاہے عنایت کرے۔ اور اللہ کا فضل بہت بڑا ہے۔"

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری ہو جائے

تعلیم اور ملازمت

اِس وقت جو اس تعمیم کے ساتھ تعلیم ہو رہی ہے۔ اور تعلیم کو اس سے بھی زیادہ عام کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اچھی طرح طالب علموں کے ذہن نشین کر دینا چاہیئے۔ کہ نوکری کے خبط کو سر میں نہ آنے دیں ورنہ تعلیم سے فائدہ کی جگہ الٹا نقصان اُٹھائیں گے۔ اور ہمیشہ کے لئے اپنی زندگی اور نہ صرف اپنی زندگی بلکہ اور بہت سی زندگیاں جو اُن کے ساتھ وابستہ ہیں سب کو تلخ کر دیں گے۔ میرے اِس بیان سے کوئی صاحب ایسا نہ سمجھیں کہ مَیں تعلیم کی طرف سے لوگوں کے دلوں کو اُچاٹ کرتا ہوں۔ میرا مقصود ہرگز یہ نہیں۔ مَیں تو تعلیم کو اور اسی تعلیم کو جو ان دنوں ہو رہی ہے۔ ہر فردِ بشر کے لیئے نہایت ضروری خیال کرتا ہوں۔ کیونکہ مجھ کو وہ دن آتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ اگرچہ جب تک

وہ آئے - میں دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا۔ مگر
مجھ کو وہ دن آتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جبکہ یہی
تعلیم شرطِ زندگی ہونے والی ہے۔ اور زندگی سے
میری مراد ہے معزز اور مطمئن زندگی۔

زندگی زندہ دلی کا ہے نام
مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

میرا مطلب صرف اسقدر ہے۔ کہ جو لوگ تعلیم پا رہے
ہیں اور تعلیم تو سبھی کو پانی چاہئے۔ غرض سارے
تعلیمیافتہ اگر ایک ہی پیشہ پر جھک پڑیں گے۔ گو وہ
پیشہ فی حد ذاتہ کیسا ہی وسیع کیوں نہ ہو۔ یہ اُس کا
ضروری اور بدیہی نتیجہ ہے۔ کہ سب بھوکوں مریں۔
لوگوں کی ضرورتیں متنوع ہیں۔ اور اسی لئے دنیا
میں متنوع پیشے چل پڑے ہیں۔ انسانی ضرورتوں
اور پیشوں کے تنوع سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ دنیا میں
روزی کی کمی نہیں۔ مگر ہم ایک پیشہ خاص کے مقید
ہوکر روزی کو تنگ کر لیتے ہیں۔ اب یہ ایک سوال
پیدا ہوتا ہے۔ کہ نوکری کے علاوہ دوسرے پیشوں کے

لیے تعلیم ہی کی کیا ضرورت ہے۔ جواب یہ ہے کہ
تعلیم سے تو کبھی کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ پیشہ بھی
بے نیاز نہیں ہوا۔ ہاں تعلیم سینہ بسینہ ہوتی رہی
ہے۔ یا نقل و تقلید سے اس زمانہ میں یہ نئی بات
پیدا ہوئی ہے۔ کہ ایک ایک چیز اور ایک ایک کام
علم مستقل قرار پایا ہے۔ مثلاً موسیقی کہ ہمارے ہاں
سینہ بسینہ اس کی تعلیم ہوتی ہے۔ یا نقل و تقلید
سے لوگ اس کو حاصل کرتے ہیں۔ مگر تم نے انگریزی
بینڈ بجتے دیکھے ہونگے۔ کہ اونچی اونچی میزوں کا ایک
حلقہ ہے۔ لوگ مزامیر لئے اُس کے گرد کھڑے ہیں
ہر ایک کے آگے ایک کتاب دھری ہے۔ صدر مقام
پہ بینڈ ماسٹر کھڑا ہوا باجے بجوا رہا ہے۔ انگریزوں
کی ولایت میں تو یہ حال ہو گیا ہے۔ کہ درزی اور
حجام اور موچی اور لوہار تک اپنا پیشہ نہیں چلا سکتا
تا وقتیکہ اس نے سبقاً سبقاً اپنے پیشے کی تعلیم نہ
پائی ہو۔ اور یہ بات سب پر روشن ہے کہ ہندوستان
کل باتوں میں یورپ کی تقلید کرتا چلا جا رہا ہے۔

اور تقلید کے بدوں اس کو چارہ نہیں۔ یہ تعلیم گو کسی خاص پیشے کی نہ بھی ہو تاہم اس سے اتنی آگہی تو انسان کو ضرور ہوجاتی ہے۔ کہ وہ جس کام کو اختیار کریگا۔ اس کو کر دکھائے گا۔ اور سلیقہ کے ساتھ کر دکھائے گا۔

میری طالب علمی کے زمانے میں جو لوگ دہلی کالج میں پڑھتے تھے۔ اگرچہ اُن دنوں کی پڑہائی سے اِن دنوں کی پڑہائی میں عمدگی بہت زیادہ ہے۔ مگر اس پُرانی پڑھائی میں یہ برکت تھی کہ کالج کے طالب علموں نے مختلف کام اختیار کئے اکثر تو نوکری کی لائن میں گئے۔ بعض زمینداری لے کر بیٹھے بعض نے تجارت کی لیکن جو جس حال اور شان میں تھا مشار الیہ بالبنان تھا۔ اگرچہ مروجہ تعلیم قومی اور ملکی ضرورتوں کے لئے کافی نہیں۔ مگر یہ اُس کی تمہید ہے۔ یعنی اس رنگ میں رنگنے کے لئے اسکو پہلا ڈوب سمجھنا چاہیئے۔ لیکن وہ آخری رنگ تو تب ہی اچھا چڑھے گا کہ نوکری کی تخصیص اُٹھادو۔ اور

کسی کام کے پیشے کو عار نہ سمجھو۔ آجکل کے تعلیم یافتہ لوگوں کا ماٹو ہونا چاہیئے :-

"ہرچہ آید در پیش نگزارد درویش"

لکیر کا فقیر

مسلمانوں کو ایک لکیر کا فقیر نہیں ہونا چاہیئے ہرچہ آید درپیش نگزارد درویش۔ دنیا میں جتنی وجوہ معاش ہیں یا ہو سکتی ہیں۔ ان میں سے کوئی وجہ معاش عرف کو تو مارو گردن۔ عقلاً شرعاً بے عزتی نہیں اور جو پیشے بیعزت خیال کیئے جاتے ہیں۔ وہ اصل میں اس سے بے عزت ہوئے کہ بے عزتوں نے ان کو اختیار کیا ؎

ہرچہ گیرد علتی علت شود
کفر گیرد کاملے ملت شود

ابھی چند روز ہوئے میں نے علی گڈھ کالج میگزین میں سیّد احمد خاں کا ایک مضمون پڑھا۔ جس میں

انہوں نے بزرگان دین یعنی اصحاب کے پیشے
گنوائے ہیں۔ ان میں کوئی بزاز تھا۔ کوئی قسائی
کوئی درزی۔ کوئی لوہار۔ کوئی بڑھئی۔ کوئی بھٹیارا۔
اگر ان پیشوں میں کوئی ان کی توہین سمجھے تو وہ
خود قابل توہین ہے۔ زمرۂ مشائخ میں شیخ فریدالدین
عطار منصور حلاج کیسے مشہور ہیں۔ حدیث میں آیا
ہے۔ کہ کوئی پیغمبر ایسا نہیں گذرا جس نے بکریاں
نہ چرائی ہوں۔ غرض جب تک ہندوستان میں
کوئی سا پیشہ بھی اپنی ذات سے ذلیل سمجھا جاتا
ہے۔ ایک تعلیم نہیں ہزار تعلیم کیوں نہ ہو
ہندوستانیوں کو تو فلاح ہوتی نہیں۔ یورپ
اور امریکہ کی سند تو تم مانوگے نہیں اچھا تو تم
مسلمانوں ہی میں میمنوں اور بوہروں اور پنجابیوں
کو دیکھو کہ یہ لوگ کسی قسم کی تجارت کو عار نہیں سمجھتے
پھیری تک یہ پھریں۔ ٹاٹ یہ سئیں بساط خانہ اور
چنبل بانا۔ اور برچون اور لوہا اور نواڑ اور گوٹا ٹھپا
اور کپڑا اور ہر قسم کا مال ولایت کوئی چیز بھی تو ان

لوگوں سے نہیں بچی تو جیسے ذو فنون اور ہر با بی
ہیں ویسے ہی ماشاءاللہ چشم بد دور خوش حال بھی
ہیں۔ ابھی حال کا مذکور ہے۔ کہ بمبئی کے حاجی زکریا
سیٹھ نے یتیم خانے کے لئے ایک دم سے دو لاکھ
روپیہ دیدیا۔ یہاں دو لاکھ آدمیوں سے بھی دو لاکھ
نہیں مل سکتا۔ ننگی نہائے گی کیا اور نچوڑیگی کیا۔
اور ہم لوگ جو تعلیم تعلیم پکارتے پڑے پھرتے ہیں۔
ہمارا اصلی مطلب بھی یہی ہے۔ کہ سب مسلمان
میمنوں اور بوروں اور پنجابیوں کی طرح مال دار
ہو جائیں۔ اور وہ بے تعلیم کے ہونا نہیں۔ تعلیم پاکر
کچھ لوگ نوکری میں گھس گئے۔ اور جن کو نوکری
نہیں ملے گی وہ کچھ نہ کچھ کرکے کھائیں گے۔ اوّل
تو تعلیم ہی اُن کو کچھ نہ کچھ کرنے پر مجبور کریگی تعلیم
نے اُن کے حوصلوں کو فراخ۔ اُن کی ہمتوں
کو بلند۔ اُن کی غیرتوں کو مشتعل کر دیا ہوگا۔ وہ
احدی اپاہج دوسروں کے دست نگر بن کر بیٹھ
ہی نہیں سکیں گے۔ گو وہ دوسرے اُن کے باپ

یا چچا تائے یا نانا ماموں ہی کیوں نہ ہوں۔ اور
پھر جو کچھ بھی کریں گے نا تعلیمیافتہ سے بمدارج بہتر
کریں گے۔ خدا نے چاہا تو مٹی ہاتھ میں لیں گے اور
سونا کر دکھائیں گے۔ ؎

آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشہ چشمے بما کنند

اور یہ جو ہمارے ملک میں خاک پڑی اُڑ رہی ہے
واللہ ہمارے نا تعلیم یافتہ ہونیکی بے برکتی ہے۔
ورنہ ہندوستان کی سرزمین اور ہم ٹکڑوں کو محتاج

تہیدستانِ قسمت را چہ سود از رہبر کامل
کہ خضر از آبِ حیواں تشنہ می آرد سکندر را

اے اہلِ شاہ جہان پور مسلمانوں کی جو حالت ہے،
تمہارے پیش نظر ہے۔ اب فرماؤ کہ کچھ کرنا یا نہیں
کرنا۔ ہم کو تو اس سے کہ تم پٹھان اور سپاہی زادے
ہو تم سے بڑی بڑی امیدیں ہیں۔ ہمت اور جرأت
اور غیرت جو تمہاری خلقی اور جبلی صفتیں ہیں۔
جب تک تم نے تعلیم کے بارے میں ان سے کام

نہیں لیا۔ نہیں لیا۔ اور جب لینے پر آؤگے تو
تم مجلی ہو گئے۔ اور باقی سب مصلی۔ گھڑ دوڑ ہوتی
ہے تو جو گھوڑا سب سے آگے اور ہیری ہو اُسکو
مجلی کہتے ہیں اور دوسرے نمبر کے گھوڑے کو مصلی
خدا کرے مجلی اور مصلی دونوں تم ہی ہو۔ مگر وہ
گھڑ دوڑ کے مصلی نہ وہ مجلی جیسے سُنا کرتے ہو۔ کہ
فلاں شخص نے باوا کی فاتحہ کی تو اتنے ملّا لئے یا
مصلی کھلائے ❖

تو پشت سے ہے پیشہ سپہ گری

مجھ کو اس شعر سے استشہاد کرنا ہے۔ کہ غالب
شاعر یکتائے روزگار ہو کر اپنے پیشہ آبائی سپہ گری
پر فخر کرتا ہے۔ انگریزی عملداری امن کی عملداری
ہے۔ یعنی اس میں شاذونادر لڑائی کی ضرورت
واقع ہوتی ہے۔ اس پر بھی میں نے دربار ولایت
یہی دیکھا ہے۔ کہ سویلینز کے مقابلے میں ملٹری

افسرز کی بہت زیادہ عزّت کی جاتی ہے۔ اس
واسطے کہ ان کا پیشہ سپہ گری معزز ہے۔ اے
اہلِ شاہ جہان پور ساری دنیا اس بات کو تسلیم
کرتی ہے کہ تم ذات کے پٹھان اور موروثی اور
پیدائشی سپاہی ہو۔ اور یہ تمہارا ہی طفیل ہے۔ کہ
عموماً تمام مسلمانوں کو گو وہ پتلی دال کے کھانے
والے شیخ ہی کیوں نہ ہوں۔ بنیوں اور بنگالیوں
کی طرح گیگلا اور پھسپھسا اور بودا نہیں سمجھا جاتا
تم کو ایک مدت دراز سے اپنی ذاتی بہادری
کے جوہر دکھانے کا موقع نہیں ملتا۔ لیکن
گاؤ زوری ہی تو بہادری کے ظاہر کرنے کا ایک
متعین ذریعہ نہیں ہے۔ کچھ تم کو خبر بھی ہے کہ
تمہاری قوم پر یعنی سب مسلمانوں پر اور خاصکر
تم پر ایک غنیم چڑھ آیا ہے۔ اور وہ مال اور
آبرو اور عزّت کا خواہاں ہے۔ تمہاری حمیّت
کہاں سوئی پڑی ہے۔ کہ اس دشمن کو دفع نہیں
کرتے۔ غضب تو یہ ہے۔ کہ تم کو ابھی تک دشمن

کے چڑھ آنے کی خبر بھی نہیں۔ یوں تو دشمن
کے ساتھ بڑا لاؤ لشکر ہے۔ مگر اُس کی فوج
کا سپہ سالار ہے جہالت۔ خاص خاص لوگوں
کی شخصی حالت شاید بوجہ من الوجوہ پہلے سے
بہتر بھی ہو۔ مگر برادری اور قوم پر نظر ڈالیے گے
تو پاؤ گے کہ روز بروز مسلمانوں کے ہاتھ سے
دولت نکلتی چلی جاتی ہے۔ اور بے دولتی کا
ضروری نتیجہ ہے بے عزتی اور ذلت اور خواری
زمینداری اور تجارت۔ نوکری وغیرہ جتنے پیشے
معاش پیدا کرنے کے ہیں۔ کہیں بھی تو مسلمان
خوشحال نہیں دکھائی دیتے۔ کبھی تو سوچا کرو
کہ آخر اس کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب
ہے وہی جہالت۔ جس کو میں نے غنیم اور
دشمن سے تعبیر کیا تھا۔ اور جہالت سے میری
مراد ہے روٹی کما کھانے کے ہنر کو نہ جاننا۔ تو
اتنی بات میں آپ صاحبوں کو سمجھا دوں گا کہ
ان پڑھ تو ان پڑھ ہم میں جو لوگ فارسی عربی

منقول یعقول سب کچھ گھول کر پئے بیٹھے ہیں
ان کو بھی روٹی کما کھانے کا ہنر نہیں آتا۔ نظر
کو وسیع کرو تو معلوم ہو کہ مسلمانوں کو فمن
اضطر فی مخمصۃ کی نوبت آگئی ہے۔ اور
جن کو نہیں آئی تو وہ فارغ نہ بیٹھیں۔ اُن کو
نہیں آئی تو ان کی اولاد کو آئے گی یا اولاد کی
اولاد کو آئے گی۔ مگر یہی لچھن ہیں تو آئیگی ضرور
مجھے اس سے یہ تو غرض ہے نہیں کہ مسلمان حقیقت
میں فاقے کرتے ہیں۔ یا آگے چل کر فاقے کرنے
لگیں گے۔ بلکہ غرض ہے معاش کی تنگی عزت
اور آبرو اور فارغ البالی کے ساتھ معاش کا پیدا
کرنا اس زمانے میں کچھ آسان کام نہیں ہے
اور یہ معاش کا پیچ ایسا ہے کہ روز بروز کستا
چلا جاتا ہے۔ وہ بادشاہی وقتوں کی بات تو رہی
الگ کہ اپنی سلطنت تھی۔ انگریزی عملداری میں
جب یہ پولیس کا انتظام ہوا تو مجھ سے یہ معاملہ
پیش آیا کہ صاحب مجسٹریٹ نے فرمایش کی کہ

ہم کو انسپکٹر دو۔ بھلا اب کوئی ڈپٹی کلکٹر کسی کو
ایک دم سے ہیڈ کانسٹبل تو کرا دے ۔ فکر معاش
ایسی چیز نہیں کہ لوگوں کو اس کی ترغیب دینے
کی ضرورت ہو۔ اس میں کمی نہیں اور کمی ہو بھی
نہیں سکتی ۔ کمی اس میں ہے ۔ کہ لوگ ذریعۂ
معاش کے بہم پہنچانے میں غلطی کرتے ہیں۔ کوئی
سی بھی معاش ہو سب کا مدار تو اس زمانے میں
آکر ٹھیرا انگریزی تعلیم پر اور یہی جگہ ہے جہاں
مسلمانوں کا پانی مرتا ہے۔ انگریزوں کی ولایت
کا تو یہ حال ہو گیا ہے۔ کہ کسی مبتذل سے مبتذل
پیشے میں آدمی روٹی کمانے کے قابل نہیں ہوتا
تا وقتیکہ اس نے سینہ بسینہ نہیں اسی پیشے کی
سبقاً سبقاً کتابی تعلیم نہ پائی ہو۔ اور کوئی دن کو
ہندوستان کا بھی یہی حال ہونا ہے۔ اہلِ یورپ
نے ایک ایک اور ایک ایک کام کو ایک بنا دیا
ہے۔ اور یہ تعلیم جو تم دیکھتے ہو۔ اور وہ بھی تم سے
نہیں بن پڑتی یہ تو صرف ایک نوکری کے کام

کی ہے اور بس۔ اور یہی بڑا سبب ہے۔ کہ تعلیم کی طرف سے ابھی سے لوگ بیدل ہو چلے ہیں۔ کیونکہ لوگ ضرورت سے زیادہ بہت زیادہ نوکری کے لئے طیار ہوتے ہیں۔ بقاعدہ تجارت جب ضرورت سے زیادہ کسی قسم کا مال جمع ہو جاتا ہے۔ تو ضرور ہے کہ اس کی قیمت گھٹے اور پھر بھی ایک جزو کثیر کی نکاسی نہ ہو۔ قوم کی حالت سخت ناامیدی کی حالت ہے۔ وہ ایک مرض مہلک میں مبتلا ہے۔ اور زیادہ تر رنج کا مقام یہ ہے کہ ان میں کے بعض لوگ ان کے مرض کا حکمی علاج بھی کر جانتے ہیں۔ اور وہ علاج کے بتانے اور کرنے میں دریغ بھی نہیں کرتے۔ بلکہ خدا نے ان کے دل میں ایسا رحم دیا ہے۔ کہ وہ ایک ایک کے سر ہوتے ہیں۔ دوا کچھ ایسی گراں بھی نہیں مگر گراں ہوتی جاتی ہے۔ اور مرض کی بھی ہے۔ اور قوم کا حال یہ ہے۔ کہ وہ کہتے ہیں ہم ہرگز بیمار نہیں اور ہم کو کوئی علاج درکار نہیں

اور جو کچھ سُننے سے اپنے تئیں بیمار سمجھتے اور
علاج کرانے آتے ہیں وہ علاج میں بے تدبیریاں
کرتے ہیں۔ طبیب کی رائے پر کاربند نہیں ہوتے
پھر ایسے بیماروں کا تو خدا ہی حافظ ہے۔ نوکری
کے لئے تیاری کرنا اور کثرت امیدواروں کی وجہ
سے ناکام رہنا اور تعلیم کو بے سود سمجھنا۔ اسی کو تو
مَیں نے علاج کی بے تدبیری کہا۔ اچھا اب تم
پوچھ سکتے ہو۔ کہ پڑھ لکھ کر آدمی نوکری نہ کرے
تو کیا کرے ہل جوتے۔ بنئے کی دوکان لیکر بیٹھے
پڑھیں فارسی بیچیں تیل ٭ یہ دیکھو قدرت کے کھیل
تو سب صاحب اچھی طرح کان کھول کر سُن
رکھیں کہ جو شخص صرف نوکری کی توقع سے
انگریزی پڑھتا ہے۔ اس کی کامیابی کے احتمالات
اب بھی ضعیف ہیں۔ اور آئندہ اور بھی ضعیف
ہوتے ہوتے آخرکار شاید نِل ہو جائیں۔ امیدواروں
کی کثرت دیکھ کر نوکری کو ایک انار و صد بیمار کہنا
ذرا بھی مبالغہ نہیں اور یک انار و صد بیمار بھی اب

ہے آگے آگے یک انار و ہزار بیمار کہنا ہو گا*

قصّہ حضرت نوحؑ

قرآن کی غرض و نہایت ہے۔ لوگوں کے معتقدات اور اخلاق اور معاملات کی اصلاح اور جہاں کہیں اس میں واقعات گزشتہ کا بیان ہے وہ بھی اسی غرض سے ہے۔ کہ لوگ دوسروں کے حالات سُنکر متنبہ ہوں عبرت پکڑیں۔ اپنا چال چلن درست کریں۔ چنانچہ ایک سیدھا مسلمان نوحؑ کے اس قصّے سے اتنا ہی مطلب اخذ کرتا ہے۔ کہ نوحؑ ایک پیغمبر ہو گزرے ہیں۔ دوسرے پیغمبروں کی طرح اُنہوں نے بھی اپنی اُمت کو خدا شناسی اور خدا پرستی کی تلقین کی۔ باوجودیکہ نوحؑ اُن کو ساڑھے نو سو برس تک وعظ و نصیحت کرتے رہے ان پر کچھ اثر نہ ہوا۔ اور آخرکار طوفان آیا اور نوحؑ اور معدودے چند مسلمان جنکو اُنہوں

نے اپنے ساتھ کشتی میں سوار کر لیا تھا۔ وہ تو بچے باقی سب غرق ہو گئے۔ وہ قصہ سننا تو ہے۔ مگر اس کی اصل مطلب پر ہے۔ کہ مجھ کو خدا شناس اور خدا پرست ہونا چاہیئے۔ کہیں ایسا نہ ہو میں بھی خدا کے غضب میں آجاؤں۔ لیکن اب ایسا وقت آیا ہے۔ کہ لوگ ایسی سادہ دلی کے ساتھ قرآن کو سننا نہیں چاہتے۔ جس طرح بلاتشبیہ وکیل اور بارسٹر پینل کوڈ کے لفظ لفظ پر حجتیں کرتے ہیں۔ اسی طرح لوگ قرآن میں بال کی کھال نکالنا چاہتے ہیں۔ ایک آیت اور میں جھگڑے۔ اب یہ نوح کا مختصر ہی سا قصہ ہے۔ مگر یہ لوگ سیدھی طبیعت کے ہوں تو سیدھے مسلمانوں کی طرح ارادت اور عقیدت سے سنیں۔ انہوں نے تو قرآن کو معاذ اللہ شطرنج کی بساط قرار دیا ہے۔ اور اس میں برد و مات کے نقشے سوچتے ہیں۔ اور فی زعمہم خوش ہیں۔ کہ ہم اجتہادی مسلمان اور استدلالی دیندار ہیں۔ اور اگر انصاف کے

ساتھ اپنے نفس کا احتساب کریں۔ تو سمجھیں کہ دین سے بمنازل دور ہیں یخٰدعون اللّٰہ والذین آمنو وما یخدعون الا انفسھم وما یشعرون دین و مذہب کے اعتبار سے طبیعت کی یہ افتاد بہت ہی بُری افتاد ہے۔ مگر کیا کیا جائے۔ خدا کسی مصلحت سے اب ایسی طبیعتیں پیدا کرتا ہے۔ اب ہیں بتاؤں کہ ایسی کر بڑی طبیعتوں کے لوگ نوحؑ کے اِس تھنڈھر قصے کو کس نظر سے دیکھیں گے وہ پوچھیں گے۔ کہ نوحؑ کس کے بیٹے کس کے پوتے کس کے پڑوتے تھے۔ یعنے اُن کا نسب نامہ آدم تک نہیں۔ بلکہ ابرہ سے صفاروی و سقراطیسی تک کا کیا ہے۔ کس ملک میں تھے۔ اور کس زمانے میں تھے۔ پھر خدا جو کہتا ہے۔ کہ ہم نے ان کو پیغمبر بنا کر بھیجا۔ پیغمبر ہے کیا چیز۔ اور پیغمبر کی ضرورت کبھی تھی بھی یا نہیں اور خدا نے ان کو بھیجا۔ تو کیونکر بھیجا۔ خود ان کو اپنے روبرو بلا کر حکم دیا یا نوحؑ کو خواب ہوا۔ روبرو بلا کر حکم دیا ہو تو لازم

آتا ہے کہ خدا متحیر اور مجسم اور متشکل ہوا اور خواب ہوا ہو۔ تو وہ نوح کو اپنا خیال ہوا۔ پھر الی قومہ صاف دلالت کر رہا ہے۔ کہ نوح ع کی خاص امت تھی۔ ان ہی لوگوں نے نافرمانی کی اور انہیں پر عذاب آیا ہوگا۔ حالانکہ عام خیال یہ ہے کہ طوفان نوح میں ساری دنیا غرقاب ہو گئی تھی۔ اور پھر خدا شناسی اور خدا پرستی کو طوفان سے تعلق کیا۔ طوفان آیا ہوگا۔ تو آکسیجن ہائڈروجن کے پروپورشن میں کسی وجہ سے فرق آیا ہو۔ پھر جب تک جیالوجی اور فزیالوجی سے طوفان کی تصدیق نہ ہو کوئی سائنٹفک مین تو اس کو باور کرنے کا نہیں۔ اور نوح ع اور ان کے رفقا کشتی میں بچ بھی گئے۔ تو اس میں نوح نے کمال ہی کیا کیا۔ اور اگر یہ مطلب ہے۔ کہ نوح ع نے سب سے پہلے کشتی ایجاد کی۔ تو کشتی کا ایجاد کرنا نہ معجزہ ہے۔ اور نہ اس ایجاد کی بنا پر نوح ع پیغمبری کا دعویٰ کر سکتے ہیں پھر اور سب باتیں تو تحقیق طلب ہیں۔ اور

تحقیق کے پیچھے جیسا کچھ نتیجہ نکلے۔ مگر اس
ساڑھے نو سو برس عمر کو کوئی کیسے مان سکتا
ہے۔ پرانے کھنڈروں کے کھودنے سے
کبھی کی گڑی دبی لاشیں برآمد ہوئی ہیں۔ اور بڑی
مشکل سے ان کا پتہ لگایا گیا ہے۔ اور یہ بات
حد یقین کو پہونچ گئی ہے۔ کہ ہمیشہ سے آدمی کا
یہی قد و قامت رہا ہے۔ اور یہی اوسط عمر۔ اور جس
طرح لوگوں میں مشہور ہے۔ کہ کوئی عوج بن عنق
تھا۔ اور سمندر اس کے ٹخنوں تک آتا تھا۔ اور
وہ ہاتھ بنچا کر کے سمندر کی تہ سے مچھلیاں نکالنا
اور آفتاب سے بھون بھون کر کھاتا۔ اور باوجودیکہ
موسے کا قد ستر گز کا تھا۔ اور ستر ہی کا اُن کا نیزہ اور
ستر ہی گز اُچھلے اس پر بھی وہ عوج کے ٹخنے تک
پہونچے۔ یا جس طرح جدے میں باوا آدم کا بڑا
لمبا مزار بنا ہے۔ اور اس پر ان کی درازی قد کو
قیاس کیا جاتا ہے۔ غرض جس طرح یہ ڈھکوسلے
لوگوں میں مشہور ہو گئے ہیں۔ اسی طرح اگلے

لوگوں کی عمر کے بارے میں بھی غلط روایتیں اور
بے اصل حکائیتیں چل پڑی ہیں۔ جن کو کوئی سائنٹفک
یقین ایک لمحہ کے لئے بھی تو یقین نہیں کر سکتا۔ تو
ہو نہ ہو قرآن میں برس سے متعارف برس
مراد نہیں ہوگا۔ عجیب نہیں نوحؑ کے وقت میں
ششماہی یا سہ ماہی یا کسی اور وقت خاص
پر برس کا اطلاق ہوتا ہو۔ یہ تو میں نے تھوڑے
سے احتمالات نمونے کے طور پر بیان کئے ورنہ
جو جو اور جیسی جیسی باتیں ان شکیوں کو سوجھتی ہوں
گی۔ ہمارا تو ذہن بھی ان کی طرف منتقل نہیں
ہوتا۔ اور خدا نہ کرے۔ کہ منتقل ہو۔ ہم تو مذہبی
توں میں کھو لے۔ اور سادہ لوح ہی بھلے آج
ل کے گریزی طبیعت ورشکی مزاج کے لوگ
یعنی انگریزی دان جس کاوش کے ساتھ قرآن
و دیکھنا اور سمجھانا چاہتے ہیں۔ میری آج کی
ت خوب مضبوطی کے ساتھ پلّے باندھ لیں۔
وہ وضع الشئی فی غیر محلہ کرتے ہیں۔ اور انہوں

نے بالکل غلط رستہ اختیار کیا ہے ؎

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی
کیں رہ کہ تو میروی بترکستانست

مذہب اور سیانپت میں بڑا بیر ہے۔ سیانا آدمی اپنی عقل پر بھروسہ کرتا ہے۔ اور سمجھتا ہے کہ میں بھی کچھ بلکہ سب کچھ ہوں۔ اور مذہب کہتا ہے کہ میں کے گلے پر چھری۔ یہاں چاہیئے عاجزی اور مسکنت لیکن مشکل ہے۔ کہ مخالف آوازیں سنیں اور دل میں ان کو جگہ نہ دیں۔ اور مشکل ہے کہ عقل رکھیں۔ اور اس سے کام نہ لیں اور مشکل ہے۔ کہ عقل سے کام لیں۔ اور ان کو مذہب کی طرف سے شکوک واقع نہ ہوں اور مشکل ہے کہ شک بھی واقع ہوں۔ اور صاف دل سے اسلام پر بھی جمے رہیں ؁

ہجرت اولیٰ کے مہاجرین

زمانۂ آغازِ اسلام میں جب مسلمانوں کو مخالفین اسلام نے تکلیف دینی شروع کی تو ناچار حضرت محمد صلعم نے ان کو حبشہ چلے جانے کی اجازت دی اسی کو ہجرت اولیٰ کہتے ہیں۔ ان مہاجرین اولین میں حضرت کی صاحبزادی رقیہ اور اُنکے شوہر حضرت عثمان اور آپ کے پھوپھا زبیر بن العوام سمیت گیارہ مرد تھے۔ اور چار عورتیں ان کو نجاشی کے یہاں ملا امن۔ اور امن کی خبر مکے کے نومسلموں کو ملی۔ تو حضرت کے چچازاد بھائی جعفر بن ابی طالب کے ساتھ دوسری کھیپ روانہ ہوئی۔ اور اب نجاشی کی حفاظت اور حمایت میں مرد و زن اور بچے ملا کر ۸۲ تن ہو گئے۔ اُدھر کفار قریش مسلمانوں کے درپے تو تھے ہی انہوں نے تحفے تحائف دے کر نجاشی کی طرف سفیر روانہ کئے۔ تاکہ نجاشی ان مستامنوں کو اپنے

ملک سے نکال کر باہر کرے - ان لوگوں نے نجاشی سے یہ جا لگائی - کہ یہ مسلموں کا گروہ جو آپ کے یہاں پناہ گزین ہوا ہے - یہ پیرو ہیں ایک شخص کے جو مدعی نبوت ہوا ہے - اور ہمارے بتوں کی توہین کرتا ہے لوگوں کو بہکاتا ہے - اور اس نے ہمارے دین آبائی میں بڑا فتور ڈال رکھا ہے - نجاشی نے مسلمانوں کو اپنے حضور میں طلب کیا - تو ابھی مسلمان نجاشی تک پہنچنے نہیں پائے تھے - کہ سفیر قریش نے جڑ دیا کہ آپ ملاحظہ فرمائیں گے - کہ کیسے مغرور ہیں - ہر شخص آپ کو سجدہ کرتا ہے - اور ہم نے بھی کیا - اور یہ آپ کے آداب شاہی میں داخل ہے - مگر مسلمان ہرگز آپ کو سجدہ نہیں کریں گے - اور بے باکانہ نہایت بے تمیزی اور گستاخی کے ساتھ آپ کے سامنے آ کھڑے ہوں گے - یہ بات نجاشی کے کان میں ڈالی جا چکی تھی کہ اتنے میں جعفر بن ابی طالب مسلمانوں کو ساتھ لئے سراپردہ

شاہی پر آموجود ہوئے اور وہیں سے حضرت جعفر
نے پکارا۔ حزب اللہ یستاذنک یعنے خدائی گروہ
آپ کے پاس حاضر ہونے کی اجازت چاہتا ہے
نجاشی نے جعفر کی آواز سنی۔ اور اندر آنے کی
اجازت دی۔ ان سب نے جاکر نہ تو نجاشی کو سجدہ
کیا۔ اور نہ جاہلیت کے دستور کے مطابق۔ ابیت
اللعن کہا۔ بلکہ اسلامی قاعدے سے السلام علیک
کہہ کر مخاطب ہوئے۔ نجاشی نے مسلمانوں کی بھیڑ
دیکھ کر حکم دیا کہ تم میں سے ایک شخص عرض
معروض کرے۔ چنانچہ جعفر بن ابی طالب کو لوگوں
نے آگے پیش کیا۔ نجاشی نے پہلی بات جو پوچھی
وہ یہ تھی۔ کہ حزب اللہ یستاذنک پکار کر کہنے والا تم
میں کا کون تھا۔ جعفر نے کہا میں۔ پھر نجاشی نے
پوچھا۔ آداب شاہی کے مطابق تم نے سجدہ کیوں
نہیں کیا۔ جیسا کہ ہمارے دربار کا دستور ہے۔ اور
کوئی بھی ہو اسی قاعدے سے ہم کو سلام کرتا
ہے۔ جعفر نے کہا کہ ہم تو صرف خدا کو سجدہ کرتے

ہیں۔جس نے آپ کو پیدا کیا۔ اور بادشاہ بنایا او
بے شک ہمارے یہاں بھی بادشاہوں کو سجدہ
کرنے کا دستور تھا۔ مگر ہم بت پرست تھے ۔اور
اب ہم میں خدا نے ایک سچا پیغمبر بھیجا ہے ۔ اور
انہوں نے ہم کو یہی سلام تعلیم کیا ہے ۔ اور جنت
میں بھی سلام کے یہی الفاظ ہونگے ۔ اس کے بعد
نجاشی نے جعفر کو بولنے بات کرنے کی اجازت دی۔
تو جعفر نے کہا کہ آپ بادشاہ ہیں ۔ اور اہل کتاب میں
سے ہیں ۔ اور آپ کے سامنے بہت بات کرنی
خلاف ادب ہے ۔ میں چاہتا ہوں کہ قریش کے یہ
دو سفیر جو حاضر ہیں ۔ ان میں سے ایک گفتگو کرے
اور دوسرا خاموش رہے ۔ اور آپ ہماری باہمی
گفتگو کو استماع فرمائیں ۔ نجاشی نے اس کو پسند
کیا۔ تو جعفر نے کہا آپ ان سے دریافت کیجے ۔کہ
آیا ہم کسی کے غلام ہیں ۔ اور آپ کے ہاں بھاگ
کر آئے ہیں ۔عمرو بن عاص سفیر قریش بولا کہ نہیں
یہ لوگ کسی کے غلام نہیں ۔ بلکہ شریف آبرو دار

لوگ ہیں۔ پھر جعفر نے کہا کہ اب آپ ان سے پوچھئے کہ کیا ہم نے کوئی ناحق خون کیا ہے۔ جس کے قصاص کا ہم سے مطالبہ ہے۔ عمرو بولا۔ کہ خون کیسا ان کے ہاتھ سے کسی کو خراش تک بھی نہیں پہونچی۔ پھر جعفر نے کہا کہ ان سے دریافت کیجیے کہ کیا ہم کسی کا قرضہ لے کر بھاگے ہیں۔ اور اس کے ادا کے لئے ہم کو گرفتار کرایا جاتا ہے۔ عمرو نے کہا کہ نہیں ان لوگوں کو کسی کی کوڑی دینی نہیں اس پر نجاشی نے سفیران قریش سے پوچھا۔ کہ پھر تم ان لوگوں سے کیا چاہتے ہو۔ عمرو نے کہا کہ ہم اور یہ لوگ ایک دین کے پیرو تھے۔ جو ہمارے بڑوں سے متوارث چلا آیا ہے۔ یہ لوگ اس دین سے برگشتہ ہو گئے۔ تو ہماری قوم نے ہم کو آپ کی خدمت میں اس غرض سے بھیجا ہے۔ کہ آپ اُن کو ہمارے حوالے کر دیجیے۔ نجاشی نے جعفر سے پوچھا۔ کہ تمہارا پہلا کیا دین تھا۔ اور اب تمہارا کیا دین ہے۔ جعفر نے کہا

کہ ہم پتھر پوجتے تھے ۔ اور خدا کو نہیں مانتے تھے
اب ہمارا دین خدائی دین اسلام ہے ۔ جو خدا کی
طرف سے ہم کو بھیجا گیا ۔ اور رسولِ خدا اُس کو لے
کر آئے ۔ اور جیسی کتاب عیسٰی ابن مریم پر نازل
ہوئی تھی ۔ ویسی ہی ہمارے رسول پر نازل ہوئی
ہے ۔ اور یہ کتاب اُس کی تصدیق کرتی ہے ۔ اس
کے بعد نجاشی کے ایمان سے ناقوس بجایا گیا ۔ جس
کی آواز سنتے ہی قسیس اور راہب جمع ہو گئے ۔
اور نجاشی نے ان سے پوچھا کہ حضرت مسیح کے
بعد قیامت سے پہلے کسی نبی کی خبر ہے ۔ سب نے
کہا ایک نبی کی پیشین گوئی کتابوں میں لکھی ہوئی موجود
ہے ۔ اور جناب مسیح اُن کی بشارت دے گئے
ہیں ۔ اور فرما گئے ہیں ۔ کہ جو مجھ پر ایمان لائے گا ۔
وہ اُس پر ایمان لائے گا ۔ اور جو اُن کے ساتھ
کفر کرے گا وہ میرے ساتھ کفر کرے گا ۔ پھر
نجاشی نے جعفر سے مخاطب ہو کر پوچھا کہ یہ
تمہارے پیغمبر کیا تعلیم کرتے ہیں ۔ جعفر

نے کہا[1] یقرأ علینا کتاب اللہ ویامر بالمعروف وینھیٰ عن المنکر ویامرنا بحسن الجوار وصلۃ الرحم وبر الیتیم ویامرنا ان نعبد اللہ وحدہ لاشریک لہ پھر نجاشی نے فرمائش کی۔ تو جعفر نے سورۂ عنکبوت اور سورۂ روم قرآن سے پڑھ کر سنائی تو نجاشی اور سب درباری زار زار روئے اور مکرر جعفر سے فرمائش کی۔ کہ اپنے قرآن سے کچھ اور پڑھ کر سناؤ۔ جعفر نے سورۂ کہف سنائی اتنے میں عمرو نے نجاشی کے برہم کرنے کے لئے کہا کہ یہ لوگ حضرت عیسٰی اور ان کی والدہ کو نام دھرتے ہیں۔ تو نجاشی نے جعفر سے پوچھا۔ اس

---

[1] ہم کو اللہ کی کتاب سناتے۔ اور نیک کام کا حکم دیتے اور بُرے کاموں سے روکتے ہیں۔ اور پڑوسیوں کے ساتھ نیک سلوک کرنے اور کنبے والوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے اور یتیموں پر شفقت کرنے کا ارشاد فرماتے ہیں۔ اور یہ حکم دیتے ہیں کہ ہم خدائے وحدہ لاشریک لہ کی عبادت کیا کریں ۱۲

پر جعفرؓ نے سورہ مریم پڑھکر سنائیُ ۔ نجاشی نے اپنی مسواک کا ایک تنکا توڑ کر درباریوں کو دکھایا اور جعفرؓ سے کہا ۔ واللہ مازاد المسیح علی ما تقولون مثل ھذا ۔ اس کے بعد دربار برخاست ہُوا ؛

آدمی یا انسان ۔ آدمیت یا انسانیت

اسلام آدمیت انسانیت ہے ۔ اور مسلمان آدمی اور انسان اور اگر لفظ مسلمان ترجمۂ بندۂ خدا بھی کرو ۔ تو بندۂ خدا اور آدمی ۔ اور انسان کو میں مرادف یک دیگر سمجھتا ہوں ۔ میری یہ بات سن کر نہ صرف دوسرے مذہب کے لوگ تعجب کریں گے ۔ اور شاید بُرا بھی مانیں گے ۔ یہ سمجھ کر کہ مسلمان کو آدمی اور اسلام کو آدمیت کہتا ہے ۔ تو اس کے نزدیک ہم آدمی نہیں یعنی جانور ہیں ۔ مسلمان تعجب کریں گے اور شاید بُرا بھی مانیں گے ۔ اس خیال سے کہ مسلمان کو آدمی اور اسلام کو آدمیت بتاتا ہے ۔ تو اس کا

یہ مطلب کہ بے تخصیص مذہب سب آدمی مسلمان
ہیں۔ غیر مذہب والوں کو یا مسلمانوں کو میرا کہنا
بُرا لگا ہو۔ تو ان کی خفگی میری سر آنکھوں پر۔ مگر
یہ قصور عبارت اور الفاظ کا ہے۔ ورنہ میرا مقصد
کسی کو ناراض کرلینے کا نہیں ع "شر جن سے ہو وہ
بشر نہیں ہم"۔ اس سے میں نے مسلمان کو آدمی
اور اسلام کو آدمیت کہا اور کسی نے یہ سمجھا۔ کہ
میں مسلمان کے سوائے کسی کو آدمی نہیں سمجھتا
تو یہ آدمی نہ سمجھنا ویسا نہیں ہے۔ جیسا کہ حافظ
شیراز نے کہا ہے

واعظ شہر کہ مردم ملکش می نامند
قول ما نیز ہمیں ست کہ او آدم نیست

معلوم ہے کہ واعظ شہر کو آدمی نہ سمجھنے سے حافظ
صاحب کی کیا مراد تھی۔ مگر میں تو اس قاعدے پر چلتا
ہوں جو علم معانی و بلاغت اور لغت اور اصول فقہ
میں مسلّم قرار پا چکا ہے۔ کہ جب مطلق بولا جائے
تو اس سے فرد اکمل مراد ہوتی ہے۔ اور اس سے

تو مسلم اور ہمسلم کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ کہ عنقا
شاید ڈھونڈنے سے ہاتھ آجائے۔ کیمیا عجب
نہیں۔ جستجو سے ملے مگر نہیں ہاتھ آتا۔ اور نہیں
ملتا۔ تو انسان کامل اور ایسی ہی کمیابی مسلمان
کامل کی بھی ہے۔ عالمگیر کی ایک حکایت مشہور
ہے۔ کہ ایک دن نماز پڑھ کر بہت گڑگڑا گڑگڑا
کر دعا مانگ رہا تھا۔ کسی نے جو ایسی جرأت کر سکتا
تھا۔ پوچھا کہ اتنی وسیع سلطنت کے حاصل ہوئے
پیچھے بھی کیا مانگا جار ہا ہے۔ کہا آدمی اور شاید
اُسی وقت یہ شعر پڑھا ؎

آنچہ بر جستیم و کم دیدیم و بسیار ست و نیست
نیست جز انساں دریں عالم کہ بسیار ست و نیست

یہی مطلب ایک ریختہ گو نے اس طرح پر ادا
کیا ہے۔

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

اب سمجھے کہ لفظوں میں کیسے متضاد پہلو ہوتے ہیں*

دنیاوی ترقی کا اصلی گُر گیا ہے

دنیاوی ترقی کا اصلی گر کیا ہے۔ مَیں انگریزوں کو اس لئے خاص کرتا ہوں کہ اول تو ہم کو ان ہی لوگوں سے قومی تعلق ہے۔ کہ یہ ہمارے حاکم ہیں۔ ہم محکوم یہ بادشاہ ہیں۔ ہم رعیت دوسرے کیا وسعت رقبہ کے اعتبار سے اور کیا مردم شماری کے اعتبار سے اور کیا۔ ملک کی زرخیزی اور رعایا کی خوشحالی کے اعتبار سے ان کی سلطنت روئے زمین کی تمام سلطنتوں سے بیش بیش اور زبردست اور مطمئن تر ہے۔ کہتے ہیں اور سچ کہتے ہیں اور بالکل سچ کہتے ہیں۔ کہ کوئین وکٹوریا امپرس آف انڈیا کی سلطنت میں کسی وقت آفتاب غروب نہیں ہوتا۔ اس کے یہ معنی ہیں۔ کہ زمین گول ہے اور اپنے اوپر پلٹے کھاتی ہوئی آفتاب کے گرد گھومتی ہے۔ جس سے رات دن پیدا ہوتے ہیں۔ تو کسی وقت آفتاب کے غروب

نہ ہونے کا یہ مطلب ہے۔ کہ کوئین وکٹوریا ایمپرس
آف انڈیا کی سلطنت اس قدر وسیع ہے۔ کہ اس
کا کوئی نہ کوئی حصّہ ہمہ وقت محاذی آفتاب رہتا
ہے۔ اگر ایمپرس وکٹوریا کی سلطنت میں کسی
وقت آفتاب نہ ڈوبنے کے یہی معنی ہیں۔ تو
ان میں بھی شاعرانہ مُبالغہ نہیں ہے۔ بلکہ حکایت
واقعی اور نفس الامری ہے۔ روئے زمین کا
ایک کرہ لو اور جغرافیہ کے نقشوں کی رُو سے اس
پر جا بجا ملکہ کی عملداری کے نشان کرو۔ تو پاؤ گے
کہ جا بجا ملکہ کی عملداری اس کثرت سے ہے۔ کہ
گویا ایک چپّہ بھر جگہ ملکہ کی تو ملکہ کی عملداری میں کسی
وقت آفتاب کے غروب نہ ہونے کا یہ مطلب
ہُوا کہ اس عملداری میں آفتاب عدل و انصاف
ہمہ وقت تاباں و درخشاں رہتا ہے۔ اور یہ ایک
ایسی بات ہے کہ کوئی متنفس انکار نہیں کر سکتا
اچھا پھر انگریز ایک چھوٹے سے جزیرے انگلستان
کے رہنے والے کس کمال کے بنے ہُوئے

ہیں۔ کہ ربع مسکوں کے اکثر حصّے پر پھیل گئے۔
اور پھیلنا بھی بادشاہوں کا سا پھیلنا کہ اپنے سے
دس گنے پچاس گنے سو گنے ہزار گنے بلکہ زیادہ
گنے باشندوں کو زیر کر کے ان پر حکمرانی کر رہے
ہیں۔ یہ کیوں۔ آیا اس لئے کہ سرد ملک کے رہنے
والے ہیں۔ نہیں۔ یا اس لئے کہ رنگتیں گوری
ہیں۔ نہیں۔ یا اس لئے کہ عیسائی ہیں۔ نہیں نہیں
نہیں۔ اچھا میں ان کی ترقی کا اصلی گر بتاؤں سائنس
سائنس کہو فلسفہ کہو علم کہو ایک ہی بات ہے۔
سائنس کی ترقی کے نہ صرف یہ معنی ہیں کہ اہل یورپ
نے سینکڑوں ہزاروں نئی باتیں دریافت اور ایجاد
کی ہیں۔ جو یونانیوں کے خواب و خیال میں بھی
نہ تھیں۔ بلکہ ایسٹرانمی (علم ہئیت) کیمسٹری (کیمیا)
نیچرل فلاسفی۔ طبعیات) جیالوجی (طبقات الارض)
باٹنی (علم فلاحت) ہسٹری (تاریخ) جیاگرفی (جغرافیہ)
شائد ہی کوئی علم ہوگا۔ جس میں فلاسفہ یورپ نے
یونانیوں کی غلطیاں نہ پکڑی ہوں۔ میں شمس العلما

خان بہادر۔ مولوی ذکاء اللہ کی طرح سائنٹفک
مَین تو ہوں نہیں۔ پھر بھی مجھ کو یوروپین سائنس
کے بتانے سے کہ مَیں نے اس کو کھایا نہیں
مگر اس کا ذائقہ چکھا ہے۔ غرض یوروپین سائنس
کے بتانے سے مجکو یونانیوں کی کئی غلطیاں معلوم
ہوئیں۔ اگرچہ مَیں جانتا ہوں اور خوب اچھی طرح
جانتا ہوں۔ کہ یونانیوں کے مسلمات کو غلط کہنا
بعض مسلمانوں کے نزدیک کفر ہے کہ انہوں
نے یونانیوں کے مسلمات کو معتقدات مذہبی
میں داخل کر رکھا ہے۔ مگر میں اس انگریزی
سائنس کے بتانے بلکہ یوں کہو بہکانے سے یونانیوں
کے بعض مسلمات کو غلط سمجھتا ہوں۔ اس وقت
میں صرف ایک ہی بات کہنی چاہتا ہوں۔ کہ یونانیوں
کے سکھانے سے ہم لوگ باعن جد مانتے چلے
آتے ہیں۔ کہ دنیا چار عناصر سے بنی ہے۔
باد و خاک و آب و آتش۔ اور یہ چاروں بسیط ہیں
کہ ان میں ترکیب نہیں۔ اہل یورپ نے کیا کفر

پھیلایا۔ کہ ہوا میں ترکیب ثابت کی اور علم کیمیا کے
زور سے آکسیجن۔ ہیڈروجن۔ نائٹروجن۔ تین قسم
کی مختلف الخواص ہوائیں۔ الگ الگ کر کے دکھا
دیں۔ اسی تحقیقات میں منکشف ہوا کہ آکسیجن
کے بدوں آگ نہیں جل سکتی۔ نباتات کو نمو نہیں
ہو سکتا۔ جب تک ایک خاص پروپورشن یعنے نسبت
کے ساتھ آکسیجن اور ہیڈروجن کا امتزاج نہ ہو۔
پانی نہیں برس سکتا۔ انسان کو خلیفۃ اللہ کہا جاتا ہے
اور اس خلافت کے یہی معنی ہیں۔ کہ خدا نے
انسان کو عقل دی ہے۔ جس کی مدد سے وہ مخلوقات
کے خواص اور اُن کی تاثیرات اور علت و معلول
کے تعلقات کو دریافت کرے۔ اور دریافت کئے
پیچھے مخلوقات میں تصرفات کرے۔ جو اس کے
لئے بکار آمد ثابت ہوں۔ انسان ایسا کرے۔ تو
حقیقت میں وہ اپنا فرض انسانیت ادا کرتا ہے۔
اور اسی لئے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ لیکن اس کی
تحقیقات کسی درجہ تک اور اس کے تصرفات

کسی حد تک پہونچیں ۔ اس کو چاہئے ۔ کہ دائرہ عبودیت سے قدم باہر نہ رکھے ۔ سر ایزک نیوٹن جس کو یورپ کے فلسفیوں کا جدّامجد کہنا چاہئے ۔ اور یورپ کے فلسفیوں کا جدّ امجد ہوا تو ہندوستان کے نئے فلسفیوں کا پردادا ۔ بہرکیف نیوٹن بایں رسائی ذہن کہ اُسنے لاأف گرے بوٹیشن اور ایٹ ٹرکشن دریافت کرکے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے ۔ کہا کرتا تھا کہ میں جو اسرار نیچر کی ٹوہ میں لگا رہتا ہوں ۔ میری مثال اُس بچّے کی سی ہے ۔ جو سمندر کے کنارے بیٹھا ہوا گھونگے ۔ اور سیپیاں جمع کر رہا ہو اور قعر دریا میں جو موتیوں کا ذخیرہ ہے ۔ اُس کی اُس کو خبر تک نہیں سچ ہے وما اوتیتم من العلم الا قلیلا ۔ جو شخص کوئی مفید چیز ایجاد یا دریافت کرتا ہے ۔ اس کو وہیں تک فخر کرنے کا حق ہے ؎

پردہ اور اُس کا رواج

بیشک مسلمانوں پر ایسا زمانہ گزرا ہوگا۔ کہ حد درجہ کی تشدید کو جیسی ابتدائے اسلام میں حنفی فقہا نے ضروری نہ سمجھا ہو۔ لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ ہمارا ہندوستان ویسے ہی بلکہ اُس سے زیادہ تر تشدید کا محتاج ہے۔ اسی قسم کا معاملہ عورتوں کے پردے کا بھی ہے۔ بلاشبہہ پیغمبر صاحب کے زمانے تک پردے میں اتنی سختی نہ تھی۔ جتنی ہم لوگوں نے اب اپنے اوپر لازم کرلی ہے۔ لیکن میں ایک مذہبی روایت بیان کرتا ہوں۔ کہ اگر ہم نے عورتوں کے پردے کی زیادہ سختی بھی اختیار کی ہے۔ تو ضرورت دیکھ کر اختیار کی ہے۔ صحابیوں میں ایک عبداللہ بن عمر ایسے صحابی ہیں۔ کہ پیغمبر صاحب کی حرکات و سکنات میں سے کوئی چھوٹی سے چھوٹی بات اُن کو ملجاتی تھی۔ تو وہ اُس کی بھی تقلید کیے بدون نہیں رہتے تھے۔ میرا خیال یہ ہے۔ کہ

اگر اُن کو معلوم ہو جاتا۔ کہ مثلاً پیغمبر صاحب ایک منٹ میں اتنی بار سانس لیتے تھے۔ تو وہ ضرور ایک منٹ میں اُتنے ہی سانس لینا اپنے اوپر لازم کر لیتے۔ فنا فی الرسول سُنا ہو تو وہ عبد اللہ بن عمر کا حال تھا۔ اچھا تو انہوں نے ایک بار پیغمبر صاحب سے ایک حدیث روایت کی قال رسول اللہ علیہ وسلم لاتمنعوا النساء حظوظها من المساجد۔ کہ عورتوں کو خدا کی مسجدوں میں آنے سے نہ روکو۔ عبد اللہ رضی اللہ عنہ کا مطلب تھا۔ کہ عورتیں مسجدوں میں شریک جماعت ہوا کریں۔ اتفاق سے اُسی جلسہ میں انہیں عبد اللہ کے بیٹے بلال بھی حاضر تھے وہ بول اُٹھے واللہ لنمنعهن۔ ہم تو بخدا اپنی عورتوں کو مسجدوں میں نہ جانے دینگے۔ اس پر عبد اللہ بلال سے سخت ناخوش ہوئے ناقیل علیہ عبد اللہ فسبہ سبا یا ماسمعتہ سبہ مثلہ قط۔ وقال اخبرك عن رسول اللہ وتقول واللہ لنمنعهن۔ باپ بیٹے اپنی اپنی جگہ بر سر حق تھے۔ باپ کو اتباع

سنت کے آگے مناسب اور نامناسب پر نظر ہی نہ تھی۔ اور بیٹا مصلحتِ وقت کو دیکھتا تھا۔ تو جب بلال کے زمانے میں کہ وہ حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے پوتے ہوئے۔ اور خود صحابی نہیں۔ بلکہ تابعی تھے۔ پیغمبر صاحب کے زمانے سے اتنا فرق پڑ گیا تھا۔ کہ بلال عورتوں کا مساجد میں آنا پسند نہیں کرتے تھے۔ تو اب اس چودھویں صدی میں کیا حال ہوا ہوگا۔ اس پر بھی بعض حضرات متعارف پردے کے مخالف ہیں۔ اور انگریزوں کی دیکھا دیکھی چاہتے ہیں۔ کہ پردہ اُٹھا نہ دیا جائے۔ تو خیر اتنی تو آسانی کر دی جائے۔ کہ پیغمبر صاحب کے وقت کا سا پردہ رہے۔ اور اصل مطلب یہ ہے کہ اتنی آزادی حاصل ہوئے پیچھے کلیتًا پردہ کا اُٹھا دینا کچھ بات نہیں۔ پیغمبر صاحب اور بلال بن عبد اللہ بن عمرؓ کے زمانوں میں کچھ ایسا بڑا فصل نہ تھا۔ مگر اتنے ہی دنوں میں کتنا کچھ تغیر لوگوں کی طبیعتوں میں واقع ہو گیا

تھا۔ سو یہ کچھ تعجب کی بات نہیں۔ بلکہ اس میں خلق الانسان ضعیفا کا ثبوت ہے خلق الانسان ضعیفا میں انسان کا ضعف جسمانی مقصود نہیں ہے۔ بلکہ یہ آیت ایسے ہی محل پر وارد ہوئی ہے۔ جس کو پردہ کے ساتھ ایک خاص طرح کا تعلق ہے ؛

ڈیڑھ اینٹ کی مسجد

اغیار اگر ہم سے ہوں ناخوش تو عجب کیا
مدت ہوئی ہم آپ ہی اپنے سے خفا ہیں
کرنے کے لئے قالب بیجان ہیں ویکن
گر جینے پہ آجائیں تو آندھی سے سوا ہیں
ہفتاد و دو ملت ہیں کسی سے نہیں ملتے
اسلام میں شامل ہیں اور ان سب سے جدا ہیں
ڈیڑھ اینٹ کی مسجد ہے امام اسکے ہیں ہم آپ
ہم آپ ہی آواز بھی اپنی صدا ہیں
ہر مرتبہ شرمندہ ہیں ماہ رمضاں سے

اور ہائے نمازیں ہیں کہ ہر روز قضا ہیں
دنیا ہمہ تن درد ہو ہو لنے دو ہمیں کیا
ایسا بھی مرض ہے کوئی ہم جس کی دوا ہیں
یوں دیکھنے میں ایک نہیں آنکھیں ہیں دو دو
اور پھر بھی پس پردۂ کورتی و عملے ہیں
ہونا متعرض نہ مسلماں سے کہ یہ لوگ
دردی کش میخانۂ تسلیم و رضا ہیں
پس پہونچ چکی منزلِ مقصود کو وہ قوم
جن میں وہی گمراہ ہیں جو راہ نما ہیں
ہر چند تہی دست ہیں بے برگ و نوا ہیں
جو دل کے غنی ہیں۔ وہ امیر الامرا ہیں
معلوم مسلم ہے کہ اسباب تکلف
اکثر سبب زحمت و تکلیف و عنا ہیں
لیے ان کے کبھی جی سکتے ہیں اور جیتے ہیں کتنے
دنیا میں غنی کم ہیں۔ اور اکثر غربا ہیں
ہستی بھی ہے ایک قید مسلماں کے حق میں
فرمان اجل آتے ہی مجلس سے رہا ہیں

کس دن کے لئے در دسرِ جمع زر و سیم
سب ہیچ ہے جب ہم ہی سرِ راہِ فنا ہیں
تقدیر پہ شاکر ہیں توکّل پہ ہیں قانع
کاہل کے سبھی کار حوالت بخدا ہیں
سید کے عقائد کی تو کہتے نہیں لیکن
امت پہ محمدؐ کی دل و جاں سے فدا ہیں
یہ عمر کہ ہے بیٹھ کے اُٹھنا متعذر
اور قوم کی خدمت میں لگے صبح مسا ہیں
بد سنتے ہیں اور کرتے چلے جاتے ہیں نیکی
گویا لبشر از صنفِ ملک زیر سما ہیں
سادات کی عادات ہیں عادات کے سادات
یہ لوگ مجسم کرم و جود و سخا ہیں
قوم ان کے بزرگوں نے بنائی تھی اور اب بھی
سادات ہی تسکین دہِ اُمید و رجا ہیں
گر ان کو نہ ہو درد ہمارا تو کسے ہو
آخر تو یہ اولادِ شہِ ہر دو سرا ہیں
چندوں کے حواری ہیں مگر ساتھ ہیں وہ بھی

مطعون ہیں بد نام ہیں انگشت نما ہیں
ایک قوم کی قسمت ہی بُری ہو تو کریں کیا
یاں جتنی تدابیر ہیں محکوم قضا ہیں
بیمار ہے اور اُس کے معالج بھی ہیں حاذق
اور نسخے بھی تاثیر میں معجون شفا ہیں
لیکن یہ مصیبت ہے کہ بیمار ہے ضدّی
جس سے کہ طبیبوں کے بھی اوسان خطا ہیں
جو چیزیں کہ اُس کے لیئے ہیں زہر ہلاہل
اس کو وہی مرغوب ہیں اور اس کی غذا ہیں
بس اس کا تو مرنا ہے عزیزو
اب صبر کریں صبر جو اس کے ورثا ہیں

زمانہ سابق کے مسلمان

ہائے وہ دورِ موافق کہ مسلمان کبھی
حشمت و سلطنت و لشکر و غنار رکھتے تھے
حاکمِ وقت تھے اور ملک سے لیتے تھے خراج
تاج شاہنشہی و چترِ دلوار رکھتے تھے
رعب دیتا تھا انہیں لشکرِ جرار کا کام
کہ زمانے میں بندھی اپنی ہوا رکھتے تھے
فتح اک خادمہ تھی اُن کی اور اقبال غلام
مختصر یہ ہے کہ پلّے پہ خدا رکھتے تھے
وہ بھی انساں تھے ہماری ہی طرح کے انسان
یہی صورت تھی اور ایسے ہی قویٰ رکھتے تھے
ہاتھ پاؤں اُن کے بھی دو دو ہی ہُوا کرتے تھے
وہ بھی دو آنکھیں دو گوشِ شنوار رکھتے تھے
وہ بھی تھے عالمِ اسباب میں محکومِ قضا
نہ کوئی قاعدہ قانون نیا رکھتے تھے
بین ستین و سبعین تھی مقدار حیات

اور یہی ضابطۂ صبح و مسا رکھتے تھے
مشکلیں اُن کو بھی پیش آتی تھیں وقتاً فوقتاً
وہ بھی احساسِ تکالیف و عنا رکھتے تھے
پھر وہ کیا نقص ہے جو ہم میں ہے اور ان میں نہ تھا
کونسا وصف وہ اپنے میں سوا رکھتے تھے
علاوہ ازیں ہم کو دکھائی نہ دیا فرق کہ وہ
دل جُدا دل کے خیالات جدا رکھتے تھے
دل نہ تھے آئینہ تھے صاف مجلّیٰ شفاف
نورِ ایمان کی صیقل کی ضیا رکھتے تھے
دین و دنیا کو برتتے تھے مگر عدل کے ساتھ
دونوں پلّوں کو ترازو کے تلا رکھتے تھے
متوکل تھے مگر کوشش و تدبیر کے ساتھ
اونٹ کو تھان پہ کھونٹے سے بندھا رکھتے تھے
طالبِ عزت دنیا تھے فقط دین کے لئے
ورنہ دنیا کو وہ نظروں سے گرا رکھتے تھے
کارِ دنیا میں تھے مشغول بظاہر ہمہ تن
دل مگر یادِ الٰہی میں لگا رکھتے تھے

وعدہ کرتے تھے تو بات اُن کی تھی پتھر کی لکیر
قول کے مرد تھے اور پاس وفا رکھتے تھے
امن دیتے تھے تو ہو جاتے تھے آپ اُسکی سپر
نہ کہ کہدیتے تھے اور دل میں دغا رکھتے تھے
مستحق حق کی ضرورت اگر آ پڑتی تھی
کہہ گزرتے تھے نہ کچھ باگ ذرا رکھتے تھے
ڈانٹ بتلائی ہے بڑھیوں نے بلا خوف و خطر
بادشاہوں کو اگر قصد خطا رکھتے تھے
جنتری میں سے شریعت کی وہ نکلے تھے قویم
عادت و طور و طریق صُلحا رکھتے تھے
اُن کے انفاق تھے ایثار کہ دیکھے نہ سُنے
گرچہ دنیا میں بہت جود و سخا رکھتے تھے
آپ سو رہتے تھے مہمان کی خاطر بھوکے
بلکہ بچوں کو بھی فاقے سے سلا رکھتے تھے
سر بکف رہتے تھے اسلام کی خاطر ہمہ وقت
الغرض قوم پر اپنے کو فدا رکھتے تھے
ایک کر ڈالا تھا یاروں نے پسینا اور خون

تب کہیں دین کے گلشن کو ہرا رکھتے تھے
فتنہ پرداز کوئی قوم کے حق میں ہووے
خلل انداز وہ کب اُس کو روا رکھتے تھے
فقر و فاقہ کے وہ خوگر تھے بلا استکراہ
پیٹ کو بھوک کی شدت میں کسا رکھتے تھے
بے تکلف تھے سپاہی منش آزاد مزاج
دین دارانہ ہر ایک آن و ادا رکھتے تھے
ایک درجے میں گنے جاتے تھے آقا و غلام
کم و بیش نہ چھوٹا نہ بڑا رکھتے تھے
جتنی باتیں ہیں فضیلت کی شرف کی ان میں
سب سے اپنا قدم آگے کو بڑھا رکھتے تھے
جھٹ اُڑا لیتے نئی چیز اگر دیکھ پڑیں
غار رکھتے نہ تھے اور ذہن رسا رکھتے تھے
پس وہ ممتاز تھے بالاستحقاق
لاجرم مسند عزت پہ جگہ رکھتے تھے
کاش وہ دن ہو کہ ہم بھی کہیں ہم رکھتے ہیں
کیا ہوا اس سے کہ سو بار کہا رکھتے تھے

اس قدر بے سر و ساماں ہیں کہ آئے نہ یقین
کہئے کس منہ سے کہ ہم بھی کبھی کیا رکھتے تھے

اختلافِ مذہب

ستیاناس کیا ہے یکسر کیا عرب اور کیا عجم سب کو
خدا غارت کرے اس اختلافِ دینُ مذہب کو
عجب بد عقل ہے انساں کہ با ایں دعویِ دانش
ہزاروں سال سیکھا پر نہ سمجھا اصل مطلب کو
اگر تعلیمِ دیں یہ ہے تو آخر کار سیکھ لینا
کہ خود مکتب کے لڑکوں نے کیا برباد مکتب کو
زمانے نے بہت سفاکیاں مذہب کی دیکھی ہیں
اگر شک ہو تو تم بھی آزما دیکھو مجرب کو
خدا محفوظ رکھے اس کی زد سے یہ وہ گولا ہے
نہ پیادے ہی کو چھوڑے اور نہ راکب کو نہ مرکب کو
یہ وہ آتش ہے عالم سوز جس کی ایک چنگاری
جلا دے ایک دم میں خشک و تر کو دور و اقرب کو

ڈسا ہو جس کو اس موذی نے وہ پھڈکا نہیں کھاتا
خدارا تم نہ چھو لینا کہیں اس نیش عقرب کو
مصیبت کس لئے بنتے ہو لوگوں کے کہ یہ منصب
نہ حاصل تھا نہ حاصل ہے مقرب سے مقرب کو
نہ اس آواز کو کانوں میں آنے دینا سُن رکھو
نہ ایسی بات سے زنہار کرنا آشنا لب کو
نظر کچھ مقتضائے وقت پر بھی چاہئیے کرنی
کہ دن کو کام میں مصروف ہو آرام میں شب کو
مگر تم جھونپڑوں میں دیکھتے ہو خواب محلوں کے
ذرا سوچو تو کیا نسبت گئے وقتوں سے ہے اب کو
مزاج اسلام کا ناساز ہے - اچھا نہیں لگتا
کسی کا بولنا آواز سے جان معذب کو
ولے تم لوگ یوں بیگانہ وار آپس میں لڑ لڑ کر
بالآخر وقف بنانا چاہتے ہو عارضی تپ کو
پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑو چھوڑ دو حق پر
وہ خود پہچان لے گا بے ادب کو اور مؤدب کو

پیامِ موت

نکل جائے ارمانِ گل کی ہوس کا
جو ہو جائے قسمت سے وا در قفس کا
مگر موت سے ابنِ آدم ہے عاجز
وگرنہ نہ تھا یہ کسی کے بھی بس کا
ہو انسان کیا ایسی ہستی پہ نازاں
کہ مہماں ہے دنیا میں چند یا نفس کا
کس آہستگی سے رواں ہیں قوافل
نہ بانگِ حدی ہے نہ نالہ جرس کا
الٰہی وہ کیا ہو گیا زورِ بازو
کہ ہم میں کا ایک ایک مقابل تھا دس کا
اگر اس کا فیضانِ حکمت ہو شامل
تو ہو شہدِ صافی اُگال ایک مگس کا
جو کچھ تم کو کرنا ہے کر لو عزیزو!
کہ اب وقت باقی نہیں پیش و پس کا
بچا لے رہوے سے دامانِ تقوٰی

نہ لگ جائے وصیتہ کہیں اس نجس کا
عجب کس تھا جو من وسلویٰ کے ہوتے
تھا مشتاق قثاء و فوم و عدس کا
وہ ہم ہیں اُٹھا لائے بارِ امانت
یہ زہرہ نہیں ہے کسی بو الہوس کا
ہنر ہو تو عزۃ کو پہونچو ہی پہونچو
ملا کیا نہ ہوگا کبھی عطر خس کا
نہ کرنا مساکین سے بد دماغی
سنا کیا نہیں تم نے مضمون عبس کا
فراغ وسبک روشنی و لبے لڑائی
نہ دربان کی منت نہ احسان عسس کا
اب آگے کو جینے کا ہے منہ چڑانا
ہوا جب کہ سن ساٹھ اکسٹھ برس کا
کھڑا کھائے آر اور جگہ سے نہ کھٹکے
قدم اُٹھ چکا راہ میں ایسے کھٹس کا
تمدن میں داخل ہوئی وضع یورپ
چلن ہو چلا سکۂ ملتبس کا۔

کہیں اب کے جلسے میں ایسا نہ کرنا
کہ ناغہ ہو معمول برسا برس کا

طبیہ کالج

کس قدر جلدی گزرتے ہیں جہاں میں ماہ و سال
کاش ہم کو بھول کر آئے کبھی اس کا خیال
حال جتنے ہیں وہ ہو جائینگے ماضی ایک دن
جتنے مستقبل ہیں ہو جائینگے وہ ایک روز حال
ہر منٹ اور ہر سکنڈ ایک آدمی ہے فی المثل
اس کا ہو چکنا گزر جانا ہے اس کا انتقال
جلسۂ سال گزشتہ گویا کل کی بات ہے
جمع تھے جس میں تمامی شہر کے اہل کمال
صدر میں صاحب کمشنر جلوہ گر چوں ماہتاب
دوسرے حکام گرداگرد تاروں کی مثال
وہ نہ تھا جلسہ مگر ایک کورٹ تھا بے اشتباہ
وہ نہ تھا جلسہ مگر دربار تھا بے قیل و قال

سیکریٹری پڑھ رہے تھے کس فصاحت سے رپورٹ
باغ میں جس طرح چہکے طوطیٔ شیریں مقال
ہر طرف سے مرحبا و آفریں کا شور تھا۔
ہو رہے تھے حاضرانِ جلسہ سن سن کر نہال
اور صفِ پائیں میں یہ عاجز کھڑا تھا سرنگوں
بے بضاعت بے ہنر نادم سراپا انفعال
یوں ہوا اتنے میں ارشادِ حکیم محتشم
کیا کھڑا ہے آ ادھر اور جیب سے کاغذ نکال
ایسا لیکچر دے کہ پا جائے ہمیشہ کے لئے
طبِ یونانی و انگریزی کا جھگڑا انفصال
اُن کی اس درخواست پر میں نے بھی وہ تقریر کی
جس کو سُن کر لوگ کہتے تھے کہ ہے سحرِ حلال
ایسی بے باکی سے بولے کس کا اتنا حوصلہ
اس صفائی سے کہے کوئی کسی کی کیا مجال
کوئی کوئی معترض بھی تھے کہ یہ سب لغو ہے
بے دلیل و بے سند اثبات دعوا ہی محال
گل ہوا ہی چاہتا ہے طبِ یونان کا چراغ

اور یہ جو کچھ دیکھتے ہو آخر ی ہے اشتعال
یہ عمارت کہنگی سے گل کے آٹا ہو گئی
اب نہ جالینوس کے باوا سے ہو اسکی سنبھال
طب یونانی و انگریزی کہ دو بہنیں ہیں یہ
بلے تھا باہد تول سے لڑ رہی تھیں بدخصال
گرچہ یونانی بڑی تھی پر نہ تھا اسکے تئیں
اپنی چھوٹی بہن کی پرداخت کا مطلق خیال
کوستی تھی اور یہ کہتی تھی کہ تو ہو جائے رانڈ
ٹکڑے سے روٹی کے لئے کرتی پھرے گھر گھر سوال
چھوٹی تڑ سے بول اٹھی کہ بس بک بک نہ کر
تیرے سب مٹ جائیں چھیتے اور تیرے مرجائیں لال
جب کہ دونوں میں ہوئی تھکا فضیحتہ اس قدر
اُٹھ گیا دونوں طرف سے پاس حد اعتدال
بارسے دونوں کو کسی ڈھب سے گلے ملوا دیا
ورنہ ہوتی خاندان طب کی رسوائی کمال
دور ہو کر رنجشیں پھر ہو گیا گہرا ملاپ -
اب تو سننے میں نہیں آتی کبھی جنگ وجدال

امن سے ایک ہی جگہ میں دونوں گھر آباد ہیں
لئے حسد ہے لئے گلہ لئے شکوہ لئے رنج وملال
کوئی کرتا ہے سدیدی اور نفیسی کی جھاڑ
کھینچتا ہے چیرہ دستی سے کوئی مردے کی کھال
مدرسہ طبیہ اپنی شان میں ہے منفرد
کیجئے تسلیم یا دکھلائیے ایسی مثال
درس طب اور درس طب کیسا حسن انتظام
تجربہ اور تجربہ کے ساتھ اس کی دیکھ بھال
حیف ہے صد حیف گر اس کی نہ کی جائے مدد
ظلم ہے گر دستگیر اس کا نہ ہو دست نوال
یہ ابھی تک صرف منصوبے ہیں دور از واقعات
جیسے کوئی خواب دیکھے یا کرے دل میں خیال
ڈالیے کو گڑ نہیں پیدا تو پھر کیسی مٹھاس
بانٹتے ہیں آپ لے لیے دودھ بنتے شیر مال
وقف تفریحات لایعنی ہے جو ہے جسکے پاس
پر نہیں ہے قوم کے کارن کوئی کوڑی دوال
قوم کے سر ہیں مگر احساس حالت ہی نہیں

پڑ رہا ہے مدتوں سے ملک میں قحط الرجال
اک سرے سے آگیا ہے سب کی عقلوں میں فتور
یا دماغوں کی بناوٹ میں ہے داخل اختلال
انقلاب دہر کو لوگوں نے سمجھا ہی نہیں
کیا نتیجہ ہوگا کیا انجام ہوگا کیا مآل
حاکمان وقت کی ہر چیز سے کلی گریز
وضع ہو یا طرز ہو یا علم ہو یا بول چال
ہو چکا سیراب ساری عمر الیاتشنہ کام
جو پھرے سرگشتہ دور از چشمۂ آب زلال
بود و باش بجر اور اس پر مگر سے دشمنی
بدنصیبی اس کو سمجھو یا حماقت یا ضلال
جیسے ایک تنکا مقابل ہو کسی سیلاب کے
جیسے کوئی توپ سے لڑنیکو جائے لیکے ڈھال
پڑ دکیسی آپڑا ہے صاف نقشہ مات کا
ابتدا ہی سے غلط ہوتی گئی بازی میں چال
عزت و دولت حکومت سلطنت سب کھو چکے
اب بڑا افسانہ ہے اسلام کا جاہ و جلال

گر کسی کو شاذو نادر ہے بھی انگریزی کا شوق
فرسٹ ریڈر پڑھ کے بنتا چاہتا ہے کوتوال
یا بنا کر اُڈ پری باتوں میں انگریزوں کی نقل
وہ مثل ہے ہو کے کوا ہنس کی سیکھا ہے چال
نہ نکھٹو لا نہیں سکتا کما کر ایک درم۔
ہاں اسے دیدو اُٹھا لینے کو دنیا بھر کا مال
روم و ایران ہند و مصر افریقیہ اور ایشیا
جس طرف جاؤ تنزل اور جدھر دیکھو زوال
ہو چکے دور سے وہ عبد اللہ احمد بخش کے
اب نہیں ماتا دین تلسی داس بابو شام لال
ہو گئی ہیں رسیاں جل جل کے سب خاک سیاہ
لیک نکلے ہوں کسی کے بل جلے پر کیا مجال
نازش بیجا بڑوں پر اور خود نا اہل ہیں
راگنی بیوقت کی بے تک نہ اس میں سر نہ تال
بیٹھنے لگتے ہیں احمق ناش کے آٹے کی طرح
گر کہیں سے اتفاقاً مل گئی کھانے کو دال
اُٹھ گئی دنیا سے رسم اتحاد و یک دلی

اور اسی نا اتفاقی کے ہیں یہ سارے وبال
اب یہ حالت ہے کہ گویا ایک کا دشمن ہے ایک
بس چلے اور دسترس پائے تو کر ڈالے حلال
ایسے سفاکوں سے کس کی آبرو محفوظ ہے
شیر مادر ہے جو پا جائیں کسی کا مفت مال
جنگ ہوتی دیکھ مذہب آن کو وا ئیچ ہیں
تا نہ رہنے پائے کوئی آشتی کا احتمال
یہ وہ حضرت ہیں لگے رہتے ہیں ہردم تاک میں
مکر و تلبیس و فریب و زور کا پھیلائے جال
یہ ابھرنے ہی نہیں دیتا ہے ہم کو ایک انچ
اور ہمیں چارہ نہیں چڑھنے سے تا اعلی الجبال
گر یہی اسلام ہے کر دور سے اس کو سلام
گر یہی جنت ہے اس جنت کو لے دوزخ میں ڈال
طیبات العیش سارے لے گئے اگلے بزرگ
چھیلنے کو رہ گئے ہم ناخلف رنج و ملال
ایسی کثرت کی خوشی کیا ہو کہ ہم ہیں چھ کروڑ
جن میں اکثر بلکہ اکثر سے بھی اکثر خستہ حال

کیا ہوا ہم میں اگر آسودہ ہوں بھی بعض بعض
کیا ہوا ہم میں اگر خوشحال ہوں بھی خال خال
بالیقین آدھے سے زائد مبتلائے مخمصہ
جن کو جو کچھ وقت پر ملجائے کھا لینا حلال
دن کو کھا لیتے ہیں موٹا جھوٹا آدھے پاؤ پیٹ
رات کو فاقے سے سو رہتے ہیں سب اہل عیال
یا گھروں سے ہو کے مضطر عورتیں پردہ نشین
بھیک کی خاطر نکل پڑتی ہیں برقع سر پہ ڈال
اس قدر دُبلے کہ تن پر نام کو بوٹی نہیں
حلقے آنکھوں میں پڑے پچکے ہوئے اندر کو گال
ہڈیوں کے ڈھانچ باقی رہ گئے ہیں سوکھ کر
پیٹ دیکھو کھول کر جیسے کوئی خالی پکھال
وقت تھوڑا طبع نازک داستان غم دراز
اب دعا کے ساتھ ہونا چاہئے ختم المقال
اے خدا سارے جہاں کا خالق و رازق ہے تو
اے خدا ہے ذات تیری لم یزل اور لایزال
مشکلوں نے ہم کو آگھیرا ہے چاروں سمت سے

ہم کو گردش نے فلک کی کر دیا ہے پائمال
مدرسہ طبیہ جس میں آج ہم سب جمع ہیں
یہ بھی ہے حق میں ہمارے ایک طرح کی نیک فال
یعنی کچھ دن پھر چلے ہیں طالع ناساز کے
کیا عجب شائد ہمیں بعضہ بر آرد پر و بال
یہ اور اس کے ساتھ وابستہ ہیں جتنے کاروبار
سب کو استحکام دے پروردگار ذوالجلال
آپ ملکی لارڈ ہو کر ہوں ہمارے سرپرست
جل مریں پھر مدرسہ کے حاسدان بدسگال
آپ دیں طلاب کو انعام ہم دیں آپ کو
ہر برس صدہا دعائیں یہاں بلا کر خیر نال

سر سیّد احمد خاں صاحب

بچایا ڈوبنے سے کشتی دین محمدؐ کو
الٰہی نوحؑ کی سی عمر دے سر سیّد احمد کو
نگینیں پورے ساڑھے نو سو شمسی سال گن لونگا
کہ کوئی نیچری کچھ کم نہ کر دے وقت ممتد کو
ہمیں احساں شناسی شکر پر مجبور کرتی ہے
وگرنہ ہم کمینہ پن سمجھتے ہیں خوشامد کو
تعصب ہی ترقی میں مسلمانوں کی خارج تھا
جزاک اللہ کس خوبی سے سرکایا ہے اس سد کو
کسی ڈھب سے انہیں تعلیم کے رستے پہ لا ڈالا
اگر اب بھی نہ سمجھیں یہ تو رو بیٹھیں قسمت بد کو
کیا تھا پاک اسکے جد امجد نے سنا ہوگا
بتوں کی گندگی سے خانہ کعبہ کے معبد کو
سو اسنے بھی دلوں سے دھو دیا اوہام باطل کو
کہ اس کا فرض تھا پھر زندہ کرنا سنت جد کو
مسلمانوں نے آپ اسلام کو ایسا بگاڑا تھا

کہ ہم اس کی بدولت آخر آپہنچے ہیں اس حد کو
کہ ہم کو آج دنیا میں ہے وہ رسوائی و ذلت
جو ہونی چاہیئے انجام میں کافر کو مرتد کو
جو عالم تھے انہوں نے صرف دستار فضیلت کی
بناکر دھجیاں اُس پاک پیغمبر کی مسند کو
عوام الناس فہم راز دیں سے عاجز و قاصر
لئے بیٹھے تھے رسم و راہ و تقلید سند آمد کو
خدا ہی جانے کیا اسلام کو لوگوں نے سمجھا تھا
چلے آتے تھے سب تکذیب کو ابطال کو رد کو
ادھر سائنس کا پتھراؤ کہتا تھا کوئی دم میں
کئے دیتا ہوں چکنا چور اس شیشے کے گنبد کو
سوا سنئے اپنے زور عقل سے وہ پائداری دی
کہ اب جنبش نہیں تا حشر اس قصر مشید کو
خدا کی شان وہ اب بجلی اُن ارشن ہوتے ہیں
جو کفر و زندقہ کہتے تھے انگریزی کی ابجد کو
بہت سنتے رہو جذر اسلامی سمندر کے
اب آگے دیکھنا طغیان و جوش و شورش و مد کو

یہ کنکوے ہیں انہیں قوتِ پرواز خلقی ہے
انہیں تعلیم کی دریائی پہنچائے گی فرقد کو

عزیزو یہ عملداری بڑی رحمت خدا کی ہے
غنیمت بس غنیمت جانو اس کے فضل بیحد کو

نہ کچھ تخصیص مذہب کی نہ کچھ تعئین ملت کی
جو اسود کو وہ ابیض جو ابیض کو وہ اسود کو

با طمینان اسباب ترقی جمع ہیں سارے
اگر تم کام میں لاؤ طلب کو جہد کو جد کو

علی گڈھ ہو کے سیدھی راہ نکلی ہے ترقی کی
ہمارے سامنے ہو لو جلد تر پہنچو گے مقصد کو

بچو ٹکر سے حتیٰ الوسع وقت نامساعد کی
اٹھایا ہے کسی نے یا اٹھا سکتا ہے اس زد کو

اب آزادی نے اپنا سکہ عالم میں بٹھایا ہے
نکالو مطلقاً فرہنگ سے لفظ مقید کو

کسی کی بات بھی مانا کرو ضد کی بھی اک حد ہے
خدارا چھوڑ دو اس جاہلانہ کاوش و کد کو

اگر اب بھی نہ تم نے قدر و قیمت وقت کی جانی

تو بس پتھر پہ کھدوا رکھنا اس قول مؤکد کو
کہ مٹ جاؤ گے اور برباد ہو جاؤ گے بالآخر
پکڑ پاؤں گے کیا تم نالو آں اس چودھویں صد کو
بس اپنی شاعری موقوف کر برخود غلط مت ہو
اگرچہ روکنا مشکل ہے مضمون کی آمد کو
کہیں اس شاعری کے خبط میں عادت نہ کر لینا
خلاف و شمع و وصف خط و خال و عارض و خد کو

اِسلام کیا ہے؟

عزیزو! سمجھتے ہو اسلام کیا ہے؟
وہ شے جس کا اسلام ہے نام کیا ہے؟
جو اس رمز معنی کو سمجھیں وہ کم ہیں
ولیکن بحمد اللہ ایک اُن میں ہم ہیں
غرض اس سے کچھ خود سنائی نہیں ہے
مگر ضبط کی اب سمائی نہیں ہے
اِدھر آؤ تم کو مسلماں بنائیں

تمہیں دین مذہب کی غایت بتائیں
یہ غایت ہے یک سو کرن حق و باطل
میانِ صحیح و غلط حدِ فاصل
یہ غایت ہے پہچانِ خالی بھرے کی
یہ غایت کسوٹی ہے کھوٹے کھرے کی
خدا نے جو یہ کارخانہ بنایا
اور آدم کو اس سرزمین پر بسایا
اُسے ساری مخلوق پر برتری دی
اور افواجِ عالم کی کل افسری دی
قوی تر ہیں مخلوق کی کتنی قسمیں
مگر اس کی سی عقل و دانش ہے کس میں
بظاہر یہ کمزور ہے ناتواں ہے
ولے اس کا منقاد سارا جہاں ہے
ازل میں جو علمی شرافت ملی ہے
اسی پر سے اس کو خلافت ملی ہے
طلب ہو اور اُس پر سے توفیق رہبر
تو ہر ایک خرابے میں ہیں گنج مضمر

الٰہی ہمیں جستجو اور طلب دے
خلافت کے جتنے لوازم ہیں سب دے
ہزاروں برس عمر دنیا کی آئی
کسی نے نہ کچھ تھاہ قدرت کی پائی
زمین فی المثل اک خدا ساز گھر ہے
مزیّن ہے آراستہ سر بسر ہے
ضرورت کے کل ساز و ساماں ہیں آئیں
ہم اترے ہوئے مثل مہماں ہیں اس میں
بجز اپنے کس کی شکایت کریں ہم
خدا میزباں اور بھوکوں مریں ہم
بہم اُس نے الوان نعمت کئے ہیں
یہاں بدنصیبی نے منہ سی دیئے ہیں
اُدھر سے کلوا واشربوا کی صلا ہے
مگر اپنی قسمت میں فاقہ لکھا ہے
کچھ اس طرح کے ہضم بگڑے ہوئے ہیں
کہ فاقے نہیں ہیں تو تخمے ہوئے ہیں
خدا جو نقائص سے پاک اور بری ہے

ہر ایک کام میں اُس کی دانش درستی ہے
وہ چیزیں ہمیں جن کی ہے سخت حاجت
مہیا و موجود ہیں بے مشقت
ہوا سانس لینے کو پینے کو پانی
مگر ہم نے کچھ قدر ان کی نہ جانی
تجمل تکلّف کے اسباب سارے
کسی کو نہیں ملتے بے منت پیارے
ہر میز اقسام کھانے لگائے
اجازت ہوئی جس کو جو بھائے کھائے
اگر کوئی ہے وال وہیں پہ قانع
وہ جانے نہیں میزبان اُس کا مانع
مگر اُس نے نعمت کو نعمت نہ جانا
نہ منت اٹھائی نہ احسان مانا
رہا مبتذل اور وقار اپنا کھویا
غرض اُس نے نام خلافت ڈبویا
نہ کچھ انتہا پائی عقل رسا نے
خدا ہی خود اپنے خزانوں کو جانے

مگر آدمی زاد تعلیم پا کر
پہنچتا ہے اُن تک ہنر سیکھ لگا کر
تو وہ زندگی میں مزے کر رہا ہے
زمانے کو جو وہ کہے کر رہا ہے
سلیمان ہے اور ہوا اُس کے بس میں
عناصر کے جنات اُس کے قفس میں
وہ خاصیت عرض و جوہر سے واقف
ہے فی الجملہ اسرارِ نیچر سے واقف
خلافت اُسے وہ خلافت کو شایاں
قیافے سے آثارِ دولت نمایاں
جہاں میں نہیں ذرہ بے کار کوئی
غلط۔ گر کرے اس سے انکار کوئی
جسے جس غرض سے بنایا ہے اُسنے
اُسے اُس کا رستہ دکھایا ہے اُسنے
زمین۔ آسمان۔ چاند۔ سورج۔ ستارے
کمر بستہ مصروف خدمت ہیں سارے
ہر اک کا طریق اطاعت یہی ہے

انہیں بلکہ تسبیح وطاعت یہی ہے
ہمارے بنانے سے مقصود کیا تھا
وہ انکارِ شیطانِ مردود کیا تھا
ہماری خلافت کو اُس نے نہ مانا
ہمیں اس حکومت کے قابل نہ جانا
یہ گستاخی اُس کی خدا کو نہ بھائی
اکارت گئی اُس کی ساری کمائی
خدا کے ارادے میں خارج ہوا وہ
گروہِ ملائک سے خارج ہوا وہ
خدا کی مشیت کی تکمیل کرنا
اور اس میں جہاں تک ہو تعمیل کرنا
بہرحال بندوں کو شایاں یہی ہے
ہمارا تو بس دین وایماں یہی ہے
جب اگلوں کا طرزِ عمل دیکھتے ہیں
عقائد میں اپنے خلل دیکھتے ہیں
بتاؤ تو کس کس سے ہٹتے رہے وہ
اگر پاؤں پھیلا کے لیٹے رہے وہ

بناتے اگر خیر ہنڈیا کی اپنی
نہ ہنڈیا ہی رہتی - نہ ڈوئی - نہ چینی
جدا گر ہر ایک اپنی مسجد بناتے
دوا کو مسلمان ڈھونڈے نہ پاتے
کیا جو کچھ اُس وقت کرنا تھا ممکن
مگر اب نہ راتیں رہیں وہ نہ وہ دن
رُخ خوب سے اپنے پردہ اٹھایا
ہر ایک چیز میں علم نے دخل پایا
قفس ہے تو ہو شکر ہے پر کھلے ہیں
ہوا ایک در بند سو در کھلے ہیں
خلافت کا پوچھو تو اب گر ملا ہے
بہت غوطے مارے ہیں تب ڈر ملا ہے
مگر کہتے سننے سکھانے سے کیا ہو
نہ جب تک کہ توفیق حق رہنما ہو
نمونے بہ افراط پیش نظر ہیں
مگر چوں کہ دل کور ہیں بے بصر ہیں
نہ جانیں حدیث اور نہ قرآن سمجھیں

ہوی النفس کو عین ایمان سمجھیں
شراب تعصب ملی ان کو سستی
بہت پی گئے لگ گئی فاقہ مستی
نکالا نیا دین دنیا کا دشمن
لڑیں دونوں جس طرح سوکن سے سوکن
اگر تم کو دنیا میں رہنا ہے یارو
تو اپنی جگہ دل میں سوچو بچارو
کہ تم کیا تھے اور کیا سے کیا ہو گئے ہو
فلک پر سے تحت الثرٰی ہو گئے ہو
کوئی کب تلک یہ مصیبت سہے گا
مگر مچھ سے دریا میں لڑ کر رہے گا
بھلا یہ بھی جینے کی کوئی ادا ہے
کہ محتاج ہے کوئی - کوئی گدا ہے
کسی کو ہے مقدور اگر شاذ و نادر
نہیں ضبط کرنے پہ خواہش کے قادر
وہ مصروف ہے عیش و تن پروری میں
پڑا چین کرتا ہے بارہ دری میں

اُسے قوم کے حال کی کیا خبر ہو۔
کہ دو دو بجے دن کے اس کی سحر ہو
غرض اُس کو اسباب صارف بہت ہیں
کہ خود آ سکے اپنے مصارف بہت ہیں
بلا سے گرانی سہی یا خشک سالی
کنھیا نے برسات خاصی منالی
ہر اک سمت اور جا بجا خم گڑے ہیں
درختوں پہ ریشم کے جھولے پڑے ہیں
حسینوں کی چاروں طرف ٹولیاں ہیں
برابر کی عمریں ہیں ہمجولیاں ہیں
ہنسی ہے کہیں اور کہیں قہقہے ہیں
عنادل ہیں اور باغ میں چہچہے ہیں
ہے آہوئے رم خوردہ ہر رانڈ گویا
یہ چھوٹا ہوا اُن میں اک سانڈ گویا
جہاں دولت اس طرح کی بد بلا ہے
تو ہونے سے اُس کا نہ ہونا بھلا ہے
وہ اُمت ہوں جس کے امیر اکثر ایسے

بھلا اُس کی روداد بہتر ہو کیسے
اگر بہتری ہو تو تعلیم سے ہو
سو تعلیم گنج زر و سیم سے ہو
مگر گنج آئے تو آئے کہاں سے
الٰہی برس جائے ہُن آسماں سے
پر اس غرض کی استجابت نہیں ہے
کہ اللہ کی ایسی عادت نہیں ہے
مجھے اس جگہ اک مثل یاد آئی
کہ کانوں میں آواز فریاد آئی
مسافر کوئی اترا مہمان سرا میں
بچھائی الگ چارپائی ہوا میں
نہ سونے دیا رات بھر کھٹملوں نے
رکھا مضطرب صبح تک کروٹوں نے
بہت دق ہوا اور دعا کی خدا سے
کسی طرح مجھ کو بچا اس بلا سے
لیکن تھے کھٹمل کئی دن کے بھوکے
ستانے سے اور کاٹنے سے نہ چوکے

مسافر سے جب بات کچھ بن نہ آئی
لگا کہنے بس دیکھی تیری خدائی
کوئی ہاتفِ غیب فرطِ غضب سے
مخاطب ہُوا آ کے اُس بے ادب سے
کہ ناشکر بیہودہ کیا بک رہا ہے
عبث آسماں کی طرف تک رہا ہے
تجھے دفع موذی کی قدرت ہے حاصل
کر اپنی حفاظت نہ ہو اتنا کاہل
یہ دار العمل جائے حیرت نہیں ہے
مگر تجھ کو کچھ شرم و غیرت نہیں ہے
یہ دستور از روز اوّل رہا ہے
یوں ہی کاروبار جہاں چل رہا ہے
نمایش سے ہوگا نہ پوزش سے ہوگا
جو کچھ ہوگا اپنی ہی کوشش سے ہوگا
تہی دستی اور مفلسی کے بہانے
جسے کچھ بھی ہے عقل ہرگز نہ مانے
کہیں سے تو کھاتے ہو پیتے ہو آخر

بھلی یا بُری طرح جیتے ہو آخر
اگر ہاتھ اُٹھا کر ہمیں دو گے پیسا
اُسے عار سمجھے کوئی ایسا تیسا
جو کچھ ہم کو مل جائے دستِ کرم سے
نہیں بحث اپنے تئیں بیش و کم سے
تو ہم تنفر تعصب کو چھوڑو
یہ بُت ہیں مسلمان ہو ان کو توڑو
علی گڈھ کا مشہور و ممتاز کالج
وہ امراض قومی کا حکمی معالج۔
بتائیں کہ کیوں کر ہُوا آغاز اُس کا
ہُوا جمع ساماں خدا ساز اُس کا
ہمیں تو بہت شرم آتی ہے کہتے
ولیکن نہیں بنتی خاموش رہتے
خدا جانے سچ جھوٹ ہے یا زور ہے یہ
کتابوں میں البتہ مسطور ہے یہ
کہ چھ سو برس تک کئی خانداں کے
مسلمان حاکم تھے ہندوستان کے

بزرگوں پہ نازاں ہو کیا سب کے سب تم
سُنا کیا نہ ہو گا تکم ما کسبتم
گذرگاہ دنیا تماشے کی جا ہے
اگر ہست کو نیست کہئے بجا ہے
نہیں مستمر کوئی حالت یہاں کی
ہے بادر ہوا کل عمارت جہاں کی
اگر آج ہے اک جگہ بزم شادی
تو کل ہے وہیں ماتم نامرادی
حکومت ملی سلطنت گھر میں آئی
نہ تھی ظرف عالی میں اتنی سمائی
نہ سوچے توسط کی حد سے گزر کر
بہت کھا گئے مر گئے پیٹ اپھر کر
تھی یورپ کو شہ طالع رہنموں کی
لگائے تھے سب تاک صید زبوں کی
سمندر کے اندر سے رستہ نکالا
تو پھر ملک تھا جیسے منہ کا نوالا
گئی سلطنت چھین گئی کو توالی

وہی پھر سے کُھر پاؤ ہی پھر سے جالی
حکومت کے جانے کا اک گو وہ غم ہے
اسے روئیں گے جب تلک دم میں دم ہے
ہمیں مرنا اس حال میں کیا بُرا ہے
و لے ساتھ مرنے کے کوئی مرا ہے
مثل ہے کہ کھوٹا ہو اپنا ہی پیسا
تو غیروں پہ ناحق کا الزام کیسا
کچھ ایسے روی تھے خیالات سب کے
کہ ہم خود بخود مٹ گئے ہوتے کب کے
نہ گنجائش دخل چون و چرا ہے
خدا کا ہمارا عجب ماجرا ہے
زوالِ حکومت بظاہر سزا تھی
مگر اس کی رحمت کی یہ اک ادا تھی
ہمیں ناتوان اور ضعیف اس لئے پایا
ہمارے سر سے بارِ حکومت اُٹھایا
حکومت بھی اک طرح کا دردِ سر ہے
بشر طیکہ انجام کا دل میں ڈر ہے

تم اس درد کو تاج داروں سے پوچھو
محبت کو ہم دل فگاروں سے پوچھو
حکومت تھی اک اور ہم کو محوّل
جیسے ڈال رکھا تھا ہم نے معطّل
حکومت ہے سچی حکومت قلم کی
نہ بندوق و سیف و سنان و علم کی
خدائی خزانوں کی کنجی قلم ہے
کہ جو حرف لکھتا ہے وہ اک رقم ہے
قلم کا قلم ہے قدامت سے جاری
اسی کی حکومت کو ہے پائداری
اگر اس حکومت ہم کام لیتے
تو شاہنشہی مفت بے دام لیتے
گئی سلطنت اس کے جانے کا غم کیا
نہیں پاس کاغذ دوات اور قلم کیا؟

تمت

(باہتمام ملک چراغ الدین مالک کیکسٹن پرنٹنگ انیگرول ورکس لاہور)